نازیہ رزاق

محبت غیر مشروط، لامحدود

کسی قریب المرگ شخص کی آخری سسکی نما دھند ہر شے کو نگل جانے کے در پہ تھی۔ سال تھا ماضی قریب کا، مہینہ تھا گھاتک جاڑے کا اور وقت تھا چرندو پرند کے گھروں کو پلٹنے کا۔ اندرون لاہور کے بلند و پختہ بالکنیوں اور جالی دار کھڑکیوں والے گھروں سے پکوانوں کی اشتہاء بھری خوشبوئیں، سندیسوں کے مانند گلی کوچوں میں پھیلاتے۔ بھاٹی گیٹ کے محلے میں ایک گھر کسی اور منظر کا حصہ لگتا۔ نارنجی بیلوں اور گہرے بھورے رنگ کے مغلئی نقش ونگار والے دروازوں اور کھڑکیوں میں ایک آواز چھید کرتی، راز بتاتی جاتی۔

''سرسوں کا تیل ملنے سے روح پر پڑے آبلے ملائم نہیں ہونے والے آپا!'' تیز، گرج دار نسوانی آواز پہ نارنجی پھول سر ٹکراتے سرگوشیاں پھیلاتے۔

''خدا غارت کرے ایسے صاف گریبانوں والے شرفاء کو۔ بہوؤں کی اوڑھنیاں ڈھلک جائیں تو

بات طلاق کے لفظ پہ جا ٹکتی ہے۔اور خود چاہیں تو زندہ جلا دیں۔ راتوں رات دہلیز سے باہر پھنکوا دیں۔"
سانس لینے کی تیز آواز۔
"اب مجاہد بھائی کو دکھاؤ یہ چھلسا، نیلا پڑتا بدن اور وہ عزت مآب لے کر جائیں تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس بلکہ میں خود انہیں آفس سے یہیں بلواتی ہوں۔"
آپا نیم جان سی بیٹھی تھیں۔ جسم تھا کہ سارا درد نچوڑ نچوڑ کر رگوں میں ڈال رہا تھا۔
"سائرہ! بس بھی کر دے۔" سکینہ عبدالقیوم، پانی ملا سرسوں کا تیل آپا کے بدن پہ لگائے جاتی اور چیخے جاتی۔

"نثار کمپاؤنڈر کے پاس لے کر گئی تو محلے میں دھوم مچ جانی ہے۔ ہائے مجھے تو شرم مارے ڈال رہی ہے۔ لوگوں کو یہ بتائیں گے کہ آپا کی ساس نے غسل کرتی آپا کو غسل خانہ باہر سے بند کر کے اذیت دینے کا نیا فارمولا نکالا ہے۔ پانی کی ٹنکی خالی۔ بدن پہ لگا گھٹیا تیز کیمیکل والا صابن کا چورا۔ مسلسل چار گھنٹوں میں وہ چورا تو سمجھو بدن میں یوں حلول کر گیا ہے کہ ان شاء اللہ صفیہ خالہ کی وراثت میں ہی منتقل ہوگا۔ اگلی نسل شدید خارش زدہ پیدا ہوگی دیکھ لینا۔"

سکینہ کی ملامتی نظریں ..... آپا کی سسکیاں اور سائرہ کا دائیں بائیں دھم دھم چلنا۔ صابن کا چورا جیسے سائرہ کے نتھنوں میں بھر دیا گیا ہو۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ بول بول کر اس چورے کو باہر نکالنا چاہتی اور وہ گھستا چلا جاتا۔

"اماں ہوتیں تو کہتیں ثریا عبدالقیوم ..... گھر گوند سے نہیں مشقت بھری ریاضتوں سے جڑتے ہیں اور اذیت بھری قربانیوں سے جڑے رہتے ہیں۔ اماں ہوتیں تو....." آپا سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ سائرہ کو چپ لگ گئی۔

"اماں ہوتیں تو ان کی آواز کی گونج بھاٹی گیٹ محلہ نمبر چار تک جاتی اور تمہاری ساس کی سماعتوں تک ہر ممکن دھمکی اتارتی۔ ہمارے لیے جنرل ہسپتال اتنا دور کبھی نہ ہوتا۔ تم ایسا کیوں نہیں سوچتیں آپا؟" سکینہ کی بات پہ آپا مسکرا کے رہ گئیں۔

"پچھلے ہفتے کی بات ہے شنیلہ کی جھڑپ ہوگئی اپنی ساس سے۔ غصے میں واپس آگزرے۔ تایا ابا اسے دیکھ دیکھ کر افسردہ ہوتے رہے۔ دل جوئی کے لیے ابا کا سارا دسترخوان منگوا کے دیتے رہے اور خالہ امی نے شفیق بھائی کو وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ بے چارے اگلے ہی روز ماں کو لیے معافی تلافی کرنے چلے آئے۔" سائرہ کے قلق ہی الگ تھے۔

دیوار پار رہتی خالہ اور تایا کی خانگی زندگی سے مثالیں چننے میں اس سے باکمال کوئی اور نہ تھا۔

"آپ کو یاد ہے آپا یہ وہی شنیلہ ہے جو شفیق بھائی سے شادی کے لیے کیسے ڈٹ گئی تھی اور تایا ابا اس کی شکل بھی دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے۔ اب دیکھ لو۔"

سائرہ کو سکینہ عبدالقیوم کی خشمگیں نگاہیں بھی خاموش نہ کرسکیں۔

"اچھا بھلا سفیان بھائی رشتہ مانگتے تھے۔ کتنا چاہتے تھے وہ آپا کو۔ تین بار ماموں گھر آئے تھے پرناں جی..... ساری شرافت، ماں کی تربیت کا مان وغیرہ وغیرہ آپا کو ہی دیکھنا ہوتی ہے۔"

"تو کیا کرتی؟" آپا پھٹ پڑیں۔ "ابا کو مجاہد کا سول انجینئر ہونا بہتر لگتا تھا بس۔ سفیان کی کپڑے کی دوکان انہیں میرے مستقبل کی کوئی امید نہ دیتی تھی۔ تب میں سفیان کے لیے بولتی تو آج تم لوگ اس گھر آوازیں کھلی چھوڑ نہ بول سکتی تھیں۔ ابا لے آتے سوتیلی ماں کو تم دونوں کی اچھی تربیت کے لیے۔ دینے کو میری مثال ہوتی۔ دیکھا کیسے باپ سے جھگڑ کے شادی کی سفیان سے۔ اماں کی تربیت میں کوئی جھول نہیں ہے۔ یہ سب وہ میری گھٹی میں ڈال گئی تھیں اور میں آج تک اس گھٹی کو چاٹ رہی ہوں۔ جانے تم کہاں سے سیکھ رہی ہو ایسی گفتگو..... یہ دلائل۔"

سائرہ غصے میں باہر نکل گئی۔ ابا نے ہوٹل سے کھانا بھیجا تھا۔ آپا کے اجلال کو کھانا کھلاتے، خود کھالیا، ابا ہوٹل بند کر کے گھر لوٹ آئے۔ ابا کا سوجا سرخ منہ، خارش زدہ ہاتھ پاؤں دیکھے۔ پوچھا اور چپ ہوگئے۔

رات مجاہد بھائی آئے۔ آپا ابا کو دیکھنے لگیں۔

"گھر جاؤ پتری!" وہ چپ چاپ چادر لپیٹنے لگیں۔ پھر چلی گئیں۔ گھر بھائیں بھائیں کرنے لگا۔

سکینہ عبدالقیوم کا گھر کچھ ایسا ہی تھا۔ ابا کا ہوٹل تھا درمیانے درجے کا، داتا دربار کی بائیں طرف والی گلی میں عبدالقیوم مرنجان مرنج تھے مگر فیصلوں کے ضدی۔ اماں اپنی جیٹھانی پلس بہن کا الٹ تھیں۔ انتہائی صابر اور سلیقہ شعار۔ اب تو اماں کو گئے بھی بارہ سال ہوگئے تھے۔ تین بہنوں کا بھائی نہ تھا۔ ابا کچھ لاپروا تھے۔ کچھ شریف۔ تایا اور خالہ کا خاندان ہمیشہ ان پہ حاوی رہا۔ سائرہ کو یہی بات باغی کر رہی تھی۔

ثریا آپا کا سسرال بس ایسا ہی تھا۔ منتقم مزاج اور سخت دل۔ روز ہی کچھ نہ کچھ ہوا رہتا۔ ان بہنوں کا بولنا ابا کا مفاہمتی انداز آپا کا دبو پن۔ زندگی یوں ہی چل رہی تھی بس کہ.....

☆☆☆

عام دنوں سا دن..... سرما کی ڈھلتی شام۔
پنجاب یونیورسٹی میں سیاسیات پڑھتی سکینہ عبدالقیوم کو آج گھر لوٹنے میں کچھ دیر ہوگئی تھی۔ تھکان نے جیسے رگیں کریدنے کا کام شروع کر دیا ہو۔ گلی نمبر تین کی صوفیہ اور ہمسائی دوست نادیہ ہر روز کی طرح ہمراہ تھیں۔

اردو بازار یا پھر انارکلی سے ویگن پکڑ کے تینوں اکٹھی جامعہ پنجاب آتی جاتی تھیں۔ اب تو خاصی بے تکلف دوستی ہوگئی تھی تینوں میں۔ دھند نے دھرتی پہ اترتے ہی شام کا روپ لے لیا تھا۔ پرانی انارکلی سے پیدل گزرتے صوفیہ نے چٹخارے دار آہ بھری تھی۔

"کم بختوں نے دیسی گھی کے تڑکوں کی کیسی مہک پھیلا رکھی ہے۔" روز گزرتی سکینہ نے اس دن جانے کیوں خاص توجہ سے اس قدیم مٹھائی گھر کو دیکھا۔ قدموں نے جانے کس کی اجازت سے رخ ادھر کو موڑ لیے۔

دومنزلہ عمارت رنگارنگ مٹھائیاں۔ بالائی منزل پہ بچی میز کرسیاں۔ ربڑی دودھ پیتے لاہوری۔

"اوایدر (ادھر) آیاڑ (یار) بادام والی خطائیاں تے پھڑ (پکڑ) ذرا۔" جیسی صدائیں۔

سکینہ عبدالقیوم کو دیسی گھی والا گرم مٹھائی گھر جادوئی گھر لگا تھا۔

یہاں وہاں بھاگتے چھوٹے۔ مٹھائیاں بیلتے، بھونتے، تلتے حلوائی۔ شادیوں، سالگراؤں اور دیگر تقریبات کے لیے ٹوکرے تیار کرتے چست ماہر لڑکے۔ شیشے کے بنے خانوں میں مختلف ترتیب سے بچی ہر رنگ و قسم کی میٹھی سوغاتیں۔

"ہائے سارا بچپن ماں کو روتے گزر گیا اور جوانی جامعہ پنجاب کا رستہ نگل گیا۔ یہ انارکلی گلی نمبر ایک کا نعمت خانہ پچھتاوا رقم کر گیا زندگی میں۔"

سکینہ کا تبصرہ کئی لوگوں نے سنا اور مسکرائے۔ شیشے کی دیوار کے پار پڑی مٹھائیوں کے اس اور بیٹھے وجود نے ذرا جھک کے متاثر ہوئی لڑکی کو دیکھا۔

ہاں اس نے دیکھا اور نور نظر کو جالیا۔ اسے پالیا۔

"تو سن لو، زمان و مکاں میں سماعت رکھنے والو..... سکینہ عبدالقیوم شریف محل پہ قربان ہوگئی اور ان کے سوہن حلوے کو زندگی کا دوسرا عشق سمجھ بیٹھی۔"

"یہ پڑا ہے داتا دربار اور وہ پڑا تیرے ابا کا ہوٹل۔" صوفیہ نے شیشے کے خانے پہ انگلی سے کھینچ کر نقشہ بنایا۔ جس کے شیشے پہ ناک چپکائے وہ سوہن حلوے پہ مر مر جاتی۔

"یہ رہا تیرے ابا کا ہوٹل اور یہ رہا شریف محل۔ اب اتنی زور سے بولے گی تو عشق کی خبر ابا تک جا پہنچے گی۔ پھر تجھے روز یہاں کی مٹھائیاں ہی کھانے کو ملیں گی۔" صوفیہ اپنی کہنی سکینہ کی پسلیوں میں پیوست کرتے ہوئے بولی۔ نادیہ پیسے گن رہی تھی۔

"اوکوئی ہے بھائی! کوئی سو روپے کا سوہن ہی تول دو۔ سکینہ کمینی۔ دوسرا عشق تو بتا دیا پہلا کیوں اسرار کی پرتوں میں چھپائے پھرتی ہے۔"

نادیہ نے یہاں وہاں کسی بھائی کی تلاش میں دیکھتے پوچھا۔ تب شفاف مٹھائیوں سے نقش و نگار والی دیوار کے پیچھے سے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جانے کب تک اس نے سکینہ کی چپٹی ناک اور گول ہوتی جھلکتی آنکھوں سے فیض حاصل کیا تھا۔

"یہ سوہن حلوہ۔" نادیہ بھائی نہ کہنا ہرگز نہ بھولی۔

"وہ بھی دیکھ لیتے ہیں، پہلے آپ کے سوال کا جواب تو سن لیں۔" کیسی جرات، کیا اطمینان تھا کہنے والے کے ہر ہر انداز میں۔

دستِ مسیحا
نگہت سیما
قیمت: 400 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

"اللہ مرتضیٰ بھائی۔آپ سن رہے تھے۔"صوفیہ کی باچھیں مخالف سمتوں میں چر گئیں۔ وہ نگاہیں سکینہ پہ رکھ کے بھول گیا ہو جیسے۔

"ہو گیا اب نکلیں؟" سکینہ نے تندی سے اس لڑکے کو گھورتے ہوئے صوفیہ سے کہا۔

غصیلی گھبراہٹ، ہچکچاہٹ کے گھیرے میں آ گئی تھی وہ۔ مخالف کی آنکھیں پیغام دیتی روشنائی ہو جیسے۔ سکینہ عبدالقیوم کو اپنی بائیس سالہ زندگی میں کسی نگاہ نے یوں محتاط نہ کیا تھا۔ وہ نادیہ کا ہاتھ جکڑ کے باہر کی طرف بڑھی۔

"تجسس نے آدم کو جنت سے بے دخل کروا دیا تھا۔ یہ آپ کا پہلا عشق جاننے کا تجسس مجھے میرے نامہ اعمال کی نیکیاں بڑی عزیز ہیں محترمہ۔"

طلسم کدے کے جادوگر نے جاتے جاتے بھی منتر پھونک دیا تھا۔

"کم بخت میری زندگی میں آنے والا پہلا شخص نظر باز اور اول درجے کا ڈھیٹ ہے۔" سکینہ نے چادر کا پلو سنبھالتے۔ سانس متوازن کرتے تبصرہ کیا تھا۔

"ارے نہیں بھئی میری گلی کے چنندہ خوبرو اور اعلیٰ نصب لڑکوں میں سے اول نمبر ہیں مرتضیٰ بھائی!" صوفیہ کی جھنجھلائی۔

"تو بڑا اس حلوائی کی اولاد کا نسب جانتی ہے ناں۔ نہ شرم نہ لحاظ، نہ کوئی جھجک۔ یہ بھلا کیا طریقہ ہے کسی کی ذاتی گفتگو میں مخل ہونے کا۔ ٹھیک ہے سکینہ جوش میں تھوڑا اول فول بک گئی پر وہ تو پکڑ کے بیٹھ گیا بات کا پلو، جیسے سکینہ پہلا عشق اسے ہی کہنے کو تمہید باندھ رہی ہو۔" نادیہ کو جانے کون سے قلق اٹھ رہے تھے۔ سکینہ مسکرائی۔ چھوٹا لڑکا پیچھے سے بھاگتا آیا۔

"صوفیہ باجی۔ مرتضیٰ بھائی کہتے ہیں، یہ سوہن حلوہ تو لے لو۔ باقی باتیں پھر کبھی کر لیں گے۔" نادیہ کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ سکینہ کا دل ہاں وہ بے ترتیب ہوا۔

"ناں مجھے ایک بات تو بتا۔ یہ کیا کھاتا ہے تیرا مرتضیٰ بھائی ہیں؟ کیسا ابن ڈھیٹ ہے۔ آیا بڑا شوخا۔ منہ تڑوائے گا سکینہ سے چل بھاگ کوئی پیسے نہیں۔"

سکینہ، نادیہ کے ہاتھ سے پیسے چھین کے دینے لگی۔

"اپنے مرتضیٰ بھائی سے کہنا۔ مانا کہ شریف محل سے تازہ تازہ عشق ہوا ہے مجھے۔ مگر وہ اس عشق کے جہیز میں نہیں ملا مجھے جو برداشت کیے جاؤں گی۔" چھوٹا الفاظ رٹتا واپس ہو لیا۔

سوہن حلوہ کھاتے، مغلوں کی نگری کی گلیاں ماپتے، تپی بیٹھی سائرہ کو ہنس ہنس کے قصہ سناتے وہ مخالف کے اٹل ہونے میں بے خبر تھی۔ وہ آنے والے دنوں کے پرفریب ہونے کے بارے میں بے خبر تھی۔ وہ قطعی بے خبر تھی کہ.....

جامعہ پنجاب واپس لوٹتی وہ تین لڑکیاں خوفناک ہڑبڑاہٹ کا شکار ہوئیں۔ جب شریف محل کے باہر لگے تختے پر پڑھا۔

"اپنا پہلا عشق بتائیں مفت سوہن حلوہ پائیں۔"

"توبہ ہے..... یہ جرثومے کی اولاد کیا چاند چڑھانا چاہتا ہے بھلا۔" نادیہ تشویش سے بولی۔ سکینہ نے قدموں کی رفتار طوفانی کر لی۔

"سکینہ! محتاط ہو جا بہن..... یہ سر پھرا تو خودکشی کا ارادہ کیے بیٹھا ہے۔" سائرہ کا تبصرہ۔ اگلے دن تشویش سہ گنا ہو گئی۔

"جامعہ پنجاب سے تھکے ماندے لوٹنے والوں کے لیے خاص پیشکش۔" انہیں تو خاصا پر ہجوم لگا شریف محل۔ وہ قہر کی لگامیں تھامے شریف محل میں گھسی۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ تم ضرورت سے .....کافی زیادہ جرات اور رفتار دکھا رہے ہو بنا مقابل کا مزاج جانے۔"

لہجہ بے لچک، آنکھیں سرد، کاؤنٹر پہ بیٹھے

مرتضیٰ شریف نے کیلکولیٹر پہ لکھے حرف بٹن دبا کے مٹائے۔اس کے لیے سنجیدہ ہونے کے سوا چارہ نہ رہا۔

"اور کوئی راہ بھی تو نہیں۔" کیا کوئی ہے؟" والی نگاہ سے دیکھتے وہ بولا۔

"میرے پاس تو ہے۔ جامعہ پنجاب کو اور بھی بہت سی راہیں جاتی ہیں۔"

"اور میں ہمیشہ اس کاؤنٹر کے پار بیٹھ کے تمہیں آتے جاتے بس دیکھنے والا تو ہرگز نہیں۔ جرات تو کافی زیادہ ہے مجھ میں۔ ہے ناں؟" وہ قلاقندسی ہوگئی۔

"تو یہ جرات لاہوری ہوٹل کے کاؤنٹر پہ بیٹھتے میرے ابا کو بھی دکھا آنا۔ ساری جرات کاٹ کے بھون دیں گے۔ ایسا ٹرکا لگائیں گے ناں کہ تمہارے ابا ساری عمر وہ میٹھا ہی ڈھونڈتے رہیں گے جس سے تمہاری مرچیں کم کرسکیں۔" سکینہ کا جواب برجستہ تھا تو مرتضیٰ کا قہقہہ۔

"چل پھر ملتا ہوں تیرے ابا سے۔ کیا پتا تیرے پہلے عشق کی بھنک انہیں بھی ہو۔" وہ آتش فشاں سی باہر آئی تھی۔ سہیلیاں گنگ..... سکینہ بے بس۔ منحوس شریف محل۔

☆☆☆

"جنید کو بتاؤں؟" جنید شفیق اس کی خالہ اور تایا کا اکلوتا بیٹا، دوست بھائی، سائرہ جنید کی دشمن اول۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں..... تاکہ وہ لونڈوں کو لے کے پہنچ جائے مٹھائی گھر اور پورا محلہ اور خاندان بھی اس واقعہ سے مستفید ہوجائیں۔" چیسہ کی قاش منہ میں رکھتے مزید بولی۔ "ابھی تو ایسی کوئی خاص بات نہیں کی اس نے جو اتنا ہنگامہ کھڑا ہوجائے۔"

"خاص بات میں ڈرنے لگی ہوں اس سے۔ دوستیں اب شریف محل دیکھتے ہی ہنسنے لگتی ہیں متجسس ہونے لگتی ہیں۔" وہ یہ بتانے سے ڈرگئی تھی کہ وہ خود سے ڈرنے لگی ہے۔ یہ مرد ممنوعہ پھل جیسا تھا مہلک، مگر ترغیب دلاتا۔

اندرون لاہور سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے جاتا۔ لنڈے کے عطا کردہ رنگی برنگی اون کے لبادے، ٹوپے مفلر۔

"ہم ٹھہرے ان کے لیے عصری غلام۔ کھانا خود ہے سوغاتیں بیٹیوں کو اور ہم پاگل پن کے عارضے میں مبتلا ہیں ناں، بیس بیس گلوگا جریں کش کرو۔ گھنٹوں چولہے کے سامنے کھڑے کفگیر چلاؤ اور خالہ ڈونگہ بھر حلوہ دے کے ہمارا چل چلاؤ کریں۔" سائرہ کی بڑبڑاہٹیں ناکام احتجاج تھیں۔

سارا دن خالہ کا حلوہ لے اڑا۔ شدید دھند نے شام کو ڈھیٹ رات میں بدل دیا تو وہ حلوے کا ڈونگہ لیے باہر نکلی اور..... دل چاہا واپس مڑ جائے۔

کندھوں پہ شال اوڑھے، سن ہاتھوں کو رگڑتا وہ جیسے مودب ہوا۔ بولا

"اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔" برہم سا شکوہ۔ سکینہ عبدالقیوم کیے قدم غدار نکلے۔

"آج چھٹا دن ہے سکینہ عبدالقیوم! مجھے برف ہوتے۔ تمہارا بوسیدہ کھدر کا بیگ، گھسا کینوس کا جوتا اور سیاہ سے سرمئی ہوتی شال..... ملک الموت کی قسم میں ترس گیا ہوں۔" مرتضیٰ شریف کا برف سا چہرہ بخار زدہ سا لگتا۔

"ملک الموت کے رب کی قسم! میں ڈر گئی ہوں تجھ سے۔ دوسرا عشق تو جہاں شروع ہوا وہیں مرگیا تھا پہلا بتانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ انارکلی سے نہیں لوئر مال سے رکشہ پکڑتی ہوں اب۔ اللہ تنگ کردینے والوں کو بھی پسند نہیں کرتا۔"

وہ جھٹکے سے مڑا تھا۔ بات ختم رات شروع ہوئی تھی۔

☆☆☆

سکینہ کی زندگی پھر پرانے دن اوڑھ کے اینٹھ گئی۔ جامعہ پنجاب سے گلی نمبر 1 اور گلی نمبر 1 سے خالہ کا گھر بین الاقوامی تعلقات پہ بحثیں ذوبیلہ یا

شنیلہ کی آسودہ حالی پہ گفتگو، ابا کے ہوٹل کے پر مسالے دار کھانے۔ سب پرانی چیزیں ، بوسیدہ راہیں۔سائرہ پوچھتی۔

''سکینہ، وہ مٹھائی گھر والا کافی دن ہوئے چپ ہے کیوں؟'' وہ زبان کو روکے رکھتی۔ صوفیہ کے تجزیے یوں کہ.....

''مرتضٰی بھائی تو اب محلے میں کرکٹ بھی نہیں کھیلتے۔سامنے والے خواجہ صاحب نے نیا فریج لیا۔ سب کے پوچھنے پہ بولے ، اب کھڑکیاں سنگھے تو ٹوٹتے نہیں۔ مرمت میں جو بچت لگتی تھی بیٹی کے لیے فریج خرید لیا اس کا۔ مرتضٰی بھائی کی امی کل میری اماں کو بتا رہی تھیں کہ پہلے مرتضٰی سبزیاں نہیں کھاتا تھا اب تو کچھ بھی نہیں کھاتا۔ ڈیڑھ ہفتے سے یونیورسٹی نہیں گیا اور دوست الگ ہمارا دروازہ توڑنے کو ہیں۔ میری اماں نے انہیں گڑھی شاہو کے ایک بزرگ کا بتایا ہے۔کوئی رد بلا کا تعویذ وغیرہ دیتے ہیں۔''

نادیہ مشکوک ہوتی۔

''سکینہ ! کہیں وہ تجھے اغوا تو نہیں کروانے والا۔تیزاب گردی بھی.....''

ایسے موقعوں پہ صوفیہ اور نادیہ کی جھڑپ سارا راستہ طویل تر کر دیتی۔پھر ایک دن.....

اس دن دھند نے سرد ہواؤں کو اپنا جانشین کیا تھا۔صوفیہ چھٹی پہ تھی اور نادیہ کی کلاس ساڑھے گیارہ بجے تھی۔لوئر مال سے وہ رکشہ لیتی تھی۔داتا دربار کے سامنے سے اس نے رکشہ روکا۔

''بھائی جامعہ پنجاب۔'' بتا کے پیچھے کو چلی۔

''جامعہ گورنمنٹ کالج۔'' بتا کے بیٹھ بھی گیا۔

''اس رکشے پہ میں جا رہی تھی پہلے۔'' وہ کچکچائی۔

''ہاں تو تم بھی بیٹھ جاؤ..... بھائی جلدی کر یار! آج منہ سے آگ نکالنے والے پروفیسر کی کلاس ہے۔'' نظر اندازیوں کیا جیسے وہ موجود ہی نہ ہو۔

''بھائی..... اتارو اسے۔ میں پہلے آئی تھی۔'' بچوں سی ضد تھی۔

''تم چلو یار! مجھے ناصر باغ اتار دو۔ پیسے جامعہ پنجاب کے لے لینا۔'' فائل ترتیب میں کیے گیا۔

''یہ کون سا طریقہ ہے۔ رکشہ میں نے روکا اور اب بیٹھ کے کوئی اور جا رہا ہے۔ بلے۔اترو نیچے فوراً۔'' وہ رکشے پر لکھے مغلظات رٹتی اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔

''تمہارا دل نہیں ہے محترمہ ! جو شرافت دکھا جاؤں۔تم چل کیوں نہیں رہے یار۔''

وہ بے بس سی ہوگئی۔رکشے والا بیزار۔

''باجی ! جانا تے تسی وی ادھر ہی ہے۔ راستے وچ پڑتا ہے ناصر باغ باؤ کو ادھرا تار دیں گے۔لڑائی کیوں کر دے او۔''

''یہی تو بات ہے بھائی۔ یہ راستے میں بات کرتا چھوڑ کے بھاگ جاتا ہے۔ میں اب کے ہرجانہ نہ بھروں گی۔'' ناراضی سے بولی۔ وہ سانس بھر کے بولا۔

''یہی تو بات ہے رکشہ چلا نہیں، میں ابھی بھاگا نہیں ، ہرجانے کی فکر ابھی سے ہوگئی۔ بھاگ جانے اور ہرجانے کی دہائیاں پہلے ہی شروع۔''

شکایتیں تو ادھر بھی تھیں۔ رکشے والا آنکھیں میچے دونوں کو پرکھنے لگا۔

''باجی ! بیٹھو نیں تو دوسرا رکشہ پکڑ لو۔'' رکشے والے نے للکارا۔ وہ پھولے منہ سے سوار ہوئی۔ کچھ دیر گزری۔

''میں اس دن بھاگا نہیں تھا۔ احتیاط کی تھی۔کوئی گلی میں آ رہا تھا۔'' سیدھ میں دیکھتا وضاحت کرنے لگا۔

''اور اس کوئی کے ڈر سے آٹھ دن کسی غار میں چھپے بیٹھے تھے؟'' دوبدو کہا۔ سکینہ چپ رہ۔ ساتھ ہی ساتھ خود کو سمجھایا بھی۔

وہ مسکرایا۔ ناصر باغ آ گیا۔ وہ اتر گیا۔ وہ اسے بھاگتے ، سڑک پار کرتے لڑکوں سے مصافحہ کرتے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کے نئے مناظر نے جگہ لے لی۔ گیٹ نمبر 2 پر اتر کے کرایہ دینے لگی.....

"ہوگیا ہے باجی۔ مرتضیٰ بھائی دے گئے۔"
اسے لگا کہ طالب علموں سے بھری شاہراہ پر ہر ایک نے رک کے اسے دیکھا۔ "اچھا تو یہ بات ہے؟" وہ بے تحاشا گھبرائی۔
"کون مرتضیٰ بھائی! میں کسی کو نہیں جانتی۔" دوپٹا ماتھے تک پھیلاتے ہوئے وہ محتاط سا ادھر ادھر دیکھتی ہوئے بولی۔
"یہ پکڑو اپنا کرایہ اور آئندہ اگر مجھے کہیں دیکھو بھی تو رکشہ روکنے کی جرأت نہ کرنا۔ تمہارے مرتضیٰ بھائی کی بھائی گیری تو میں پوری کرتی ہوں۔" وہ تا شقند کا آلو بخارہ ہوئی جاتی۔
"باجی! بھائی نے یہ بھی دیا ہے۔" وہ تہ شدہ کاغذ لہراتے بولا۔
"خط....." کیا یہ خط تھا اللہ..... وہ واقعی خط تھا سکینہ عبدالقیوم اپنی بائیس سال سات ماہ کی عمر میں کبھی ایسی صورت حال سے نہ گزری تھی۔ بہادر تھی۔ نڈر بھی مگر بے باک نہیں۔ خوف جیسے ہر مسام سے پھوٹ پڑا۔ جنوری کی یخ صبح میں وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔
"منحوس..... کمینہ..... زہر ہوگیا ہے میرے لیے شیرہ ہوتے ہوتے۔ ہمت تھی تو خود دیتا۔ دفع ہو جاؤ اس کاغذ سمیت....." وہ طیش سے مڑی۔ چند قدم پھر واپس آئی۔
"یہ..... کاغذ۔ ادھر دو مجھے۔ کیا بھروسا کس کس کو پڑھاتے پھرو اور وہ غالب کا نواسا جانے کون کون سی حکایتیں لکھتا رہا ہے۔ دو ادھر۔ نظر مت آنا منحوس! ورنہ ڈاکیا گیری کرنے پہ تمہارا حشر خراب ہونے والا ہے۔" کھوکھلا لہجہ' بے ربط دھمکیاں۔ گیٹ سے ڈپارٹمنٹ اور کلاس روم تک اسے مبالغہ تریسٹھ ٹھوکریں لگیں۔ دو لڑکیوں سے تصادم ہوا اور ایک لڑکے کا پیر کچلا گیا۔ زرد لب سے سر ٹکراتی مکھی دکھتی وہ۔ جامعہ پنجاب کے ٹنڈ منڈ ہوئے درخت اس پر قہقہے لگاتے اور اسے روہانسا کیے جاتے۔
"سکینہ! یہ واقعی خط ہے۔" اندر سے اندیشوں کی آواز دہلاتی۔
"ہائے سکینہ! مرتضیٰ جیسے لڑکے کا خط..... کمینی ایسا کیا ہے تجھ میں۔ پڑھ کے دیکھو تو۔"
اس آواز سے نا آشنا تھی وہ۔ لذت میں مبتلا کرتی۔ خوش فہم کرتی حتیٰ کہ فہم سے ماورا کرتی آواز.....
"خالہ کی زوبیلہ کو بھی خط ملا کرتے تھے ناں۔" مخفی سی پیشن گوئیاں۔
"کہاں زوبیلہ کے عامیانہ عشق اور کہاں سکینہ کا تغافل۔"
یہ آواز کپکپاہٹ' گھبراہٹ' ملامت کو مات دیے جاتی۔ وہ دھندا ترنے سے پہلے گھر لوٹ آئی مگر گھر میں.....

☆☆☆

"گڑھی شاہو میں ایک ملنگ بیٹھتا ہے آپا! ایک تعویذ لیتے ہیں ساس کے لیے' دوسرا مجاہد بھائی کے لیے پھر دیکھنا۔" یہ سائرہ تھی۔
"تعویذ تو ہے میرے پاس۔ محبت کا' خدمت گزاری کا۔ اماں نے دیا تھا۔ میں بے نصیب اسے دبا بیٹھی ہوں رسوئی میں۔ ساس کی پاکستی اور شوہر کی چاکری میں۔ نتیجہ بھی مل ہی جائے گا۔" یہ ثریا آپا تھیں۔
"آپا!! اسے دبانا نہیں تھا ناں..... دینے سے تو وہ سمجھوتے کا آسیب بن جاتا ہے۔ تم اسے صحن میں اگاتیں۔ ساس کی بیٹیوں میں لگاتیں اور شوہر کی آنکھوں میں سجاتیں۔ نتیجہ تمہیں حیران کر دیتا۔"
یہ سکینہ تھی امید پسند، بلند عزائم، کھدر کے بیگ کو کبھی الماری میں رکھتی کبھی سنگھار میز کی دراز میں۔ سائرہ اسے جانچ رہی تھی۔
"یوں کرو بیگ اجلال کے منہ میں رکھ دو۔ ناں یہ کبھی منہ کھولے گا نہ بیگ میں موجود بلی باہر آئے گی۔" اجلال کو گدگداتی سائرہ کا عام سا لہجہ سکینہ کو ساکت کر گیا۔ تخت پہ لیٹی آپا سر اٹھا کے دیکھنے لگیں۔ اجلال گھبرایا تھا۔ منہ میں بلی۔

"السلام علیکم عبدالقیوم کی مہارانیوں۔" خالہ اپنے گوشت بھرے وجود کو گھسیٹ کر آتے ہوئے پھولے سانس سمیت بولیں۔ سکینہ اور آپا فوراً آگے بڑھیں۔

"ناں ثریا! میری تو آج تک تجھ سے گرمی سردی نہ ہوئی کبھی۔ تو نے ہمیشہ عزت کی اور میں نے بھی ماں بننے میں کسر نہ چھوڑی مگر یہ! تو بتا بہنوں سے ملنے ہفتہ وار آ سکتی ہے تو ماں جائی کا دو بالشت دور کا مکان کیا تیری یادداشت سے محو ہو چکا ہے جو دو ماہ ہوئے ادھر کا رخ نہ کیا تو نے۔ آج تو مجھ رہا نہ گیا۔ جنید نے بتایا کہ تو آئی ہے تو اس سے کہا سکوٹر ہر پر لاد مجھے۔ آج خبر لاتی ہوں ثریا بانو کی۔"

"اماں! ثریا باجی تو سسرالی جھمیلے نبٹاتی آتی ہیں۔ بھول سکتی ہیں یا پھر الزام تھکن کو بھی دیا جا سکتا ہے مگر یہ اپنی سائرہ بانو کا بے سبب تغافل تو دیکھیے یہ کالج آتی جاتی ہمارے گھر کے سامنے سے یوں گزرتی ہے جیسے نو دو لتیے اپنے پرانے رشتے داروں کے قریب سے۔"

جنید سائرہ کو بس دیکھتا، الفاظ نہ سوچتا۔ سائرہ دبا دبا سا چٹختی۔

سہ پہر نے شام کے بعد رات کی چادر اوڑھ لی۔ خاندان، آباؤں کے سسرال، موسم، مہنگائی، سیاست، بچوں کی تعلیم و تربیت۔ چائے پیتے، پیٹھے کا حلوہ کھاتے مونگ پھلیاں ٹونگتے یہ سارے موضوعات سیر حاصل گفتگو کا موجب بنے۔ خالہ اور آپا اپنے گھروں کو لوٹیں تو خاموشی سارے میں لوٹنے لگی۔ سائرہ کا ریڈیو سننے کا وقت ہوا تو وہ جھٹ کھدر کے گھسے بیگ کی طرف لپکی۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے شدید اضطراب سے مڑ مڑ دیکھتی۔ "کرلو، کرلو، کبھی نہیں اب کرو بس۔" جیسی ہدایات اور دعوتیں۔ چھت پورے لاہور سی یخ اور روشن تھی۔

برآمدے کے سامنے ایستادہ لوکاٹ کے درخت نے ٹنڈ منڈ شاخیں بانہوں سی پھیلا رکھی تھیں۔ وہ شہر زندہ دلان کو دیکھتی رہی۔ ہوائیں سکینہ عبدالقیوم کے پیتل سے گالوں، روئیں سے بالوں کو فرط اشتیاق سے اور شور مچاتی گلی نمبر تین کی ایک بانکے کے کانوں تک راز پہنچاتیں۔

غلامان عشق معشوق کا حسن مثل یوسف نہیں چاہتے
غلامان عشق چاہتے ہیں زلیخا سی توبہ و وفا

اس نے خط کھولا، مجھو نامہ اعمال کا نیا صفحہ کھول دیا۔ خط سے مرتضیٰ امجد شریف جھانکنے لگا سکینہ عبدالقیوم کی آنکھوں میں۔ وہ سامنے ہی تو تھا۔ ہونٹ کا کونا دبائے بولتا۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے انگریزی بلاک میں منحنی سا کامران وٹو ہوتا ہے۔ شکل اتنی ناقابل بھروسا کہ کوئی سوڈا بوتل نہ پلائی مگر اس کا طوطا..... خاصا شہرہ ہے اس طوطے کا۔ کل ملا کے تینتالیس مرید ہو گئے ہیں وٹو صاحب کے..... یا پھر شاید طوطے کے۔ چند یاہ پہلے مجھے جانے کیا سوجھی، طوطے کی فال کچھ یوں تھی۔

میں کیا آدھا گورنمنٹ کالج تنہا تھا۔ خیر تب تلک کسی نے تسخیر جو نہ کیا تھا۔

میرے چچا کہا کرتے تھے۔ محبت کے بغیر مرد کسی پہاڑی سلسلے سے منسلک غیر اہم چٹان ہے۔ پاک ہوتی ہیں ایسی چٹانیں بے شکن آسودہ۔

محبت مرد کو پہاڑ بنا دیتی ہے۔ جسے روندا جاتا ہے۔ سر کرنے کی کوششیں ہوتی ہیں۔ کیل ٹھونکے جاتے ہیں۔ باندھا جاتا ہے۔ سفر کرنے والے سر پر کھڑے ہو کر کامیابی کا جھنڈا لہراتے ہیں اور پھر واپس۔ میلا کر دیتا ہے پہاڑ ہونا۔ پرشکن، ناآسودہ۔

میں چچا کا ایسا شیدائی کہ اس بات کو کان میں بولیا۔ اپنی چوبیس سالہ زندگی میں چٹان بنے اور چٹان ہی ہوا۔ خود کو پہاڑ نہیں ہونے دیا۔

کل رات میں نے قانون کی کتابیں بند کر کے اباجی کا کھاتے والا رجسٹر کھولا۔ خاندان، برادری، محلے دار، دوست احباب جن لڑکیوں کو جانتا تھا ان کا نام لکھا۔ یونیورسٹی فیلوز دوستوں کی بہنیں، اباجی کے دوستوں کی بیٹیاں کچھ یہاں وہاں سے۔ میں

جانا کہ میں اٹھارہ سے تیس سال کی کم از کم ایک سو لڑکیوں کو جانتا ہوں۔ کچھ کو کم..... کچھ کو زیادہ۔ کچھ کو با قاعدہ دلچسپی ہے مجھ میں اور کچھ کو بے قاعدہ۔ ملک الموت کی قسم مجھے کبھی کوئی موتی مالا میں اچھی نہ لگی۔ بھینگی آنکھوں اور چپٹی ناک میں تو۔ لکھتے لکھتے ہاتھ تھک گیا۔

تو لب لباب یہ سکینہ عبدالقیوم مجھے تم سے محبت نامی مرض لگ گیا ہے۔ اتنا سچا..... اتنا کھرا کہ میں اس پہ کوئی شرط نہیں لگاتا۔ نہ اہل کوہ قاف سی صورت کی نہ اہل عرش سی معصومیت لی۔ اس محبت کو نہ تو بہادر شاہ ظفر کی پڑپوتی درکار ہے نہ ہیروں کے تاجر کی دختر۔ حد تو یہ ہے صاحب کہ کوئی حد بھی نہیں لگاتا۔ بلا شرط اور بے حد محبت ہوگئی ہے تم سے واقعی یہ ہے۔"

لوکاٹ کی کسی شاخ نے خاموشی سے چیں بہ جبیں ہوتے اس کے بازو کو سہلایا تو وہ چونکی۔ یہ کیا تھا ؟ آپ بیتی یا پھر روداد میری پہلی محبت کی۔ وہ چیختی ۔نہ اس کے حسن میں قصیدہ خوانی۔ نہ عشق پرسوز کی بے تابیاں وارفتگیاں ۔ وہ پیر پٹختی نیچے آئی تھی۔ ہاں مگر لحاف میں گھستے اسے پہلا خیال یہی آیا تھا۔ نیند میں جاتے آخری خیال بھی یہی تھا۔ وہ مونچھوں کو بل دیتا کہہ رہا تھا۔

"محبت ہوگئی ہے بس ۔ شرط کوئی نہیں اور حد بھی....."

☆☆☆

آنکھ کھلنے کی وجہ سائرہ کا تشدد تھا۔ پاؤں کا انگوٹھا بڑی حد تک موڑ دیا تھا اس نے۔

"تمہیں بد دعا لگے گی مجھ بن ماں کی۔" خط لہراتے وہ دھاڑی۔ سکینہ کی آنکھیں نیند کو چت کر کے سینے پہ چڑھ بیٹھیں۔

"میرا نہیں یہ میرا نہیں ہے۔" بچکانہ بوکھلاہٹ تھی۔

"اچھا پھر ابا کا ہوگا۔" اداکاری کی انتہا تھی۔ سکینہ نے موقع دیکھتے ہی جھپٹی ماری۔

"کم بخت اٹھتے ہی کیا مروڑ اٹھا تمہیں تلاشی لینے کا۔ خبردار جو قریب آئیں۔ میں سالم نگل جاؤں گی۔ ثبوت ہی ختم۔ ابا کو بتایا تو رو رو کے وہ کو سنے دوں گی تمہیں کہ ابا کو مانتے ہی بنے گی۔" جنوری کی کڑکتی سردی میں سکینہ کا ماتھا، ہتھیلیاں بھیگ گئی تھیں تھے۔ سائرہ کو ڈھیروں ہنسی آئی۔

"کیا، کیا سوچ رہی ہے؟ ابا کو کون بتائے گا۔ ہے یہ تو ترپ کا پتا ہے۔ یونہی میں پھینک دوں گی کیا ؟ خیر چھوڑ مجھے بڑا مزا آیا ہے پڑھ کے قسم سے۔ پہلی ہی جھلکی میں بندے نے تجھے بارودی سرنگ پہ بیٹھا دیا ہے اور سمجھا دیا ہے کہ دیکھو، جہاں اور بھی ہیں۔ زیادہ اڑنے کی کوشش کی تو اڑ جاؤ گی۔"

"بندہ ..... ہونہہ تیتنی خورہ ..... بدذوق ایسے لکھتے ہیں محبوبہ کو خط؟ نہ سر نہ پیر۔ نہ الفاظ اچھوتے نہ انداز۔ منہ سنبھال رکھے اپنا۔ سوچے بھی نہ کہ گلی نمبر 3 کو کبھی تاکوں بھی میں۔ صوفیہ کو پکڑاتی ہوں واپس یہ الف لیلوی پہیلی۔ سچی بڑا دل کٹا ہے میرا۔ خط ملا بھی تو....." وہ منصوبے بناتی، تخمینے لگاتی رہی۔ تیسرے دن صوفیہ چہک چہک کے بول رہی تھی۔

"سکینہ میری سہیلی، مجھے پونے دو سال تیرے ساتھ ویگنوں، رکشوں پہ خوار ہوتے کبھی خبر ہی نہ ہو سکی کہ گلستان میں پہلا ثمر میرے ہی ہاتھوں لگنے والا ہے۔"

"مرتضیٰ بھائی جب سے یہ خط مجھے دے کر گئے تب سے میں ساعتیں ناپ رہی تھی۔ بس یہ پکڑ۔ میرا خیال ہے آتے ہوتے ناصر باغ جاتے ہیں وہیں تو ہمیں یہ پڑھ کے سنانا۔" سکینہ نے خط جھپٹا۔

"کمینی تجھے بڑا لطف آرہا ہے اس لین دین کی کڑی بننے۔ حیا کر کچھ، تو بھی ایک لڑکی ہے آخر کو۔ اگر یونہی کوئی تجھے کسی کا خط پکڑائے تو؟"

خط ملنا خاصا نایاب ہو رہا ہے لڑکی۔ اب کہاں ملتے ہیں مرتضیٰ امجد جیسے لڑکے۔" الٹا صوفیہ اس سے لڑکوں کی کم یابی کا رونا رونے لگی۔ وہ شکر کر رہی تھی کہ نادیہ ساتھ نہ تھی آج۔

یوں دوسرا خط اس نے پنجاب یونیورسٹی شعبہ

سیاسیات کی سیڑھیوں پہ بیٹھے، کتاب میں چھپائے پڑھا مگر ہائے یہ نہ چھپتی مسکراہٹ ..... چونکا دیتی آنکھوں کی لو..... فکر میں مبتلا کر دیتی ہاتھوں کی لرزش ۔متن کچھ یوں تھا۔

''مالک جاں کی قسم سچ کہا تھا..... محبت مشروط نہیں میری۔ ہرگز نہیں۔'' جذبے بمعہ شرط برابر ہوتے ہیں سوداگری کے۔ سمجھوطے پاتا ہے تم میری محبت لے لو، میں تمہاری توجہ، مستقبل وغیرہ۔ مجھے خوش رکھو گی تو تمہیں خوش ہونے سے کوئی نہ روک پائے گا۔ دیکھو پوری ناپ تول کر تم پانچ سیر دو گی میں پانچ سیر سے رتی کم نہ کروں گا اونچ نیچ کی تو میرا ذمہ توش پوش..... مانا کہ مجھ سے اسی ہلکے درجے کی محبت نہیں ہوتی۔ تم گالیاں دو، اعزاز لگتا ہے۔ منہ دھو رکھو، کہو تو مدح سرائی۔ محبت نہ بھی کرو تو میں ہوں ناں قربان شیدائی۔ سلامت رہے اس عاشق کی یک طرفہ محبت۔

سب کے باوجود مجھے انتظار رہا۔ جاں گسل سا انتظار۔ روح نوچتا۔ دل بھنبھوڑتا، لگنے لگا ہے معشوق محبت میں مبتلا نہ ہوا تو کوسنے دینے کے عارضے میں مبتلا ضرور ہو۔ اور کیا ہوتا ہے رابطے کا ذریعہ قائم رہتا ہے۔ تو سکینہ عبدالقیوم پچھلے تین دن سے میں نے بصارتوں، سماعتوں اور دل کو حکم دے رکھا ہے کہ چوکنا مت۔ محبوبہ کا پیغام آئے اور غیر کی نظر بھی پڑے۔ بدشگونی نہ ہو جائے۔ آہ خط ہنوز ندارد است۔ سنو مایوسیاں روشنی نگل جاتی ہیں۔'' وہ فقط مسکراتی رہی۔

''دوسرے ہی خط میں خاصی بہتری دکھائی ہے محترم نے۔ زبان دان نہ سہی، محبت دان لگا ہے مجھے۔ یوں جیسے پچھلے خط میں جو کوتاہیاں تھیں اب کے سدھار دیں۔ پورا وکیل ہے بہنا..... کیسے دلائل دیے لامشروط محبت کے۔'' سائرہ کو جیسے مشغلہ مل گیا۔ وہ آتی تو پہلے فائل بیگ کتابیں چھانتی۔ خط پڑھتی پھر بے لاگ تبصرے۔ سکینہ ناخن کترتی رہی۔ لکھوں؟ نہ لکھوں؟

رات سوتے سے اٹھ بیٹھی۔ ٹھٹھرتے ہاتھوں اور تمتماتے گالوں سے کاغذ، قلم سنبھالا۔ دل تو یوں بھی آج تیز گام سا چلتا تھا۔ لکھنا کیا چاہتی تھی لکھتی کیا رہی۔

☆☆☆

تین جمعرات ہوئے اسے نیاز کا زردہ بانٹتے۔ سرخ اینٹوں والے دھلے دھلائے شفاف صحن کے وسط میں وہ سیاہ رنگ لباس میں کھڑا، انگلیوں سے بال جماتا، بہنوں سے جان چھڑاتا۔

''مجھے نہیں کھانا بتول خالہ کی بہو کے ہاتھ کا ہریسا۔ یہ کیسی دہشت گردی ہے بھئی۔ میں نے ایک چاند ہوا منت مانی ہے، جمعرات کی شام زردہ بانٹنا ہے جاؤں؟''

اماں رنگ ڈھنگ نوٹ کیے جاتیں۔ بہنیں جو ہر ٹاؤن میں بستی خالہ کے گھر جانے کو بضد۔ صوفیہ لپکتی جھپکتی آئی۔ بھرا صحن دیکھ کے سٹپٹائی۔

''السلام علیکم خالہ اماں نے درس رکھا ہے۔ روما، سوما وغیرہ کو بھیجنا۔''

چھ بہنوں میں گھرا مرتضیٰ امجد صوفیہ کو دہلا گیا۔ کیسی درگت بنائیں گی یہ ماں بیٹیاں میری اگر جو انہیں خبر ہو میری ڈاکیا گیری کی۔ جھرجھری سی آئی۔

''مرتضیٰ بھائی کدھر کا رستہ ناپنے چلے ہیں؟'' بتانے پہ بولی۔

''کمال ہو گیا تیسری جمعرات ہی عرض پوری ہو گئی مرتضیٰ! بھائی اب تو مٹھائی بانٹ لیں بس۔'' ابرو نچائی صوفیہ، جمیلہ امجد کو زہر لگی۔

''اے جھلی کیسے لچک لچک کے بات کرتی ہے۔ کیسی عرض؟ کون سی منت؟'' بیٹا صوفیہ کے پیچھے لپکتا دیکھ کے وہ تلملائیں۔

''بیڑا غرق ..... یہ کہاں اڑا لے گئی مرتضیٰ کو بھائی کی فکر لو کرو، ہریسہ لیپوگی گرڈائن ہیرا لے اڑی۔''

سدا کی وہمی اماں ـــ گھبرو بیٹا یونہی ہولائے رکھتا۔ اکلوتا ہونے کی تلوار تھی جو لٹکتی رہتی۔ ''جو کوئی لے اڑی تو.....'' بیٹیاں ماں کی ہم خیال۔ محاذ خاصا

گنجلک تھا۔

☆☆☆

مرتضٰی امجد اندرون لاہور کی گلیاں دھمک دار قدموں سے ناپتا۔ یوں جیسے نادرشاہ کے سپاہی دہلی کی گلیوں میں چلتے ہوں گے۔ فتح اور وحشت کو پیشانی سے دبوچے۔

دنیا سے غافل فقیر کے پہلو میں بیٹھتے مرتضٰی نے قمیص کی جیب سے خط نکالا جو صوفیہ نے تھمایا تھا۔ اس لمحے کرہ زمین کا کوئی بھی جی دار مرتضٰی امجد کو دیکھ لیتا تو اسیری لازم ہو جاتی۔ تحریر ہونٹوں پہ انگلیاں جمائے پڑھتا۔ سکینہ نے موتی پروئے تھے۔

غلامان تحقیق کچھ اور نہیں ہوتے ماسوائے لمحہ سکوں کے
غلامان عشق قابل ہوتے ہیں فقط چاہے جانے کے

''میرا قصہ کچھ یوں ہے کہ ابا یوں تو خاصے مرنجان مرنج ہیں مگر ایک ضد کر بیٹھے چھوٹی خالہ سے محبت۔ اماں بھلی تھیں۔ صابر، سلیقہ مند۔ دادی کو اماں بھا گئیں اور شوخ و حاضر جواب الفت خالہ ابا کو۔ ابا کی شرافت نے دادی کو جتوا دیا مگر ان کی بے دلی میری ماں کو کھا گئی۔ مجھے تم سے ڈر لگتا ہے..... مجھے اس آسیب سے ڈر لگتا ہے جو ابا کو لگا تھا۔ میں نے دیکھا ہے اپنی محبت کو برتتی اپنی اماں کو ابا کی پٹڑی پہ چلتی ریل جیسی بے رونق زندگی۔ خالہ صبح ساتھ بجے اٹھتیں..... اماں چار بجے۔ ابا کی آنکھ جھپکنے سے بھی پہلے گھر چمکاتیں، بچے سنوارتیں۔ پھر نیلی شیشے کی ڈبیا اٹھاتیں، گالوں پہ رگڑتیں۔ بال ہونٹ، ناخن تک سجاتیں۔ ابا اٹھتے کچھ کھاتے اور یہ جا، وہ جا اماں کی کریم باسی ہو کے رنگ بدلتی۔ ہونٹ سرخ سے زرد۔

شام ڈھلنے کو آتی تو اماں پھر سے وہی عشق دہراتیں۔ آٹے دودھ کے لیپ۔ چوڑیوں کے بدلتے رنگ۔ سارے جتن کر لیتیں پر ابا، وہی بے حس، غیر متوجہ، اماں تھک جاتیں تو ملنے جاتیں چھوٹی خالہ کو پنڈی خالہ۔ کو دیکھتیں۔ گھر آ کر نقالی کرتیں مجھے اپنی ماں پہ ترس آتا۔ وفاداری، صبر، سلیقہ کافی نہیں کیا؟

پھر ایک دن اماں مر گئیں۔ ابا کو کچھ نہ ہوا۔ رسوئی ویران ہو گئی ہماری۔ صحن بے رونق، سمسالوں میں پھپھوندی لگ گئی۔ مرتبانوں کے پیندے سوکھ گئے۔ مرتضٰی امجد میں تلوار کی انی حلق میں دابے کھڑی ہوں۔

''محبت کروں تو کہیں ابا نہ بن جاؤں۔'' محبت نہیں ملتی تو.....

''محبت نہ کروں تو اماں نہ رہ جاؤں۔ (کسی ایک کی محبت سے پیٹ بھرا ہو تو کسی دوسرے کا دیا خالی پیالہ چاٹنا سہل ہو جاتا ہے)

دل کہتا ہے ناشکری نہ بن..... دماغ کہتا ہے پاگل۔ خط کی طلب بھی رہتی ہے اور اس سے منسلک ببول بھی تناور ہوتے جاتے ہیں۔ ڈر کے سوا اور کچھ نہیں میرے پاس۔''

وہ سر نیہواڑے بیٹھا کبوتر دیکھتا۔ لاجواب..... ناامید۔ وہ جو کچھ نہ رہا تھا، اب اس کے پاس کچھ نہ رہا تھا۔ دامن جھٹک کے آگے بڑھ جانا اسے تھکا دینے جیسے لگا۔ وہ یونانی فاتح کا سپاہی دکھتا تھکا ماندہ..... مایوسیت بھرا۔ وہ فقیر جو رخ موڑے اس کی کاغذ کے ٹکڑے کے لیے عقیدت پرکھتا تھا۔ آنکھیں میچ کے خود کلامی میں بولا تھا۔

غلامان عشق جتلا کیے جاتے ہیں سان پر تیز کیے آلہ کی آزمائش میں
غلامان عشق معشوق کے تحفہ ناسور کو بھی حرز جاں رکھتے ہیں

وہ مسکرا اٹھا۔ ''سکینہ عبدالقیوم تم وہ ہرگز نہیں کہ جسے مرتضٰی امجد نادانی گروان جائے۔''

☆☆☆

سکینہ عبدالقیوم کو جواب کچھ یوں ملا۔

غلامان عشق یک طرفہ ہو جانے کو سہل جانتے ہیں
غلامان عشق جانتے ہیں دو طرفہ کو منافقت

''پہلا خط یوں رہا کہ تمہاری گھبراہٹیں، شرماہٹیں منہ چھپائے پھرتی ہیں اور تم بنی رہتی ہو قصہ گو۔ کیا بتاؤں کیا حالت رہی۔ پہلے تو خط چھونے کی جگہ متعین نہ ہو۔ کس سیدھ میں پکڑوں۔ کس رخ پہ تھاموں..... کہیں رکھنے کو جگہ نہ ملے۔ فائلیں، جیبیں، انگیٹھیاں، تلپٹ کر دیا ان الفاظ کے اجتماع نے۔

بہر حال..... پہلا عشق کہیں اماں تو نہیں؟ ویسے تمہاری اماں تو میرے قبیلے کی لگیں۔ خدارا اپنے جیسا نہ بننا۔ محبت چاہے کونے میں رکھ چھوڑنا مگر پنڈال..... تغافل کو مت دینا۔ نظر اندازی بڑی بے وقعت کر دینے والی چابک ہے۔ اپنی اماں کا بڑا لاڈلا ہوں میں۔ سنو! سارے لاڈ تمہارے ہوئے۔ میں ہوں تو بے مصرف، مصروفیت نہ ہو۔ آنکھوں کی بے مہر، بے لچک سرد مہری..... ابرو کی ناگواری، گردن کا بے توقیر کر دینے والا جھٹکا نہ ہو۔ پھر چاہے محبت بھی نہ ہو صاحبہ!"

رکشے کے بے تحاشا جھٹکوں کے دوران سکینہ نے مرتضیٰ کے خط پہ لکیریں کھینچیں۔ پھر اسی کے نیچے چند سطریں لکھیں۔

"ثابت ہوا کہ شرط وہ پائیدان ہے، جس پہ چڑھ کے..... رک کے محبت کے منتر پڑھے جاتے ہیں اور تسخیر کیا جاتا ہے۔ منتر سنتے ہوؤں کو وہ پائیدان نظر ہی نہیں آتا۔ اگر تم نے لاشرط محبت کی خصوصیات واجزائے ترکیبی رٹوا نہ دیئے ہوتے تو آج جواب طلبی نہ ہو رہی ہوتی حلوائی صاحب کی۔"

انارکلی سے گزرتے شریف محل کے چھوٹے کو وہ کاغذ تھماتے، سکینہ غیر متزلزل لگی۔ نادیہ کا واویلا بھی خاموشی نہ توڑ سکا۔ وہ صوفیہ کو کوسے جاتی۔ سکینہ کو ڈرائے۔ سہمہ پہ کو سائرہ نے سوتے سے جھنجھوڑا۔

"کیا قیامت آ گئی ہے، مصیبت۔" وہ جھنجلائی اٹھی۔

"بہن خط کا جواب آ گیا ہے۔ یہ کس دیو کا بچہ ہے بھئی مرتضیٰ امجد۔ دروازہ بجا کے، خط تھما گیا ہے۔ توبہ سارے محلے کے شیطان کرکٹ کھیل رہے تھے باہر۔ یہ مروائے گا قسم سے۔"

سائرہ بڑبڑائی۔ سکینہ نے خط پر نظریں دوڑائیں۔

غلامان عشق تبت کے بھکشوؤں سے سخت جان ہوتے ہیں غلامان عشق ضدی ہوتے ہیں قدیم بابل کے جادوگروں سے

"غور اور گمبھیرتا مطلوب ہے۔ میں نے کہا تھا محبت چاہے نہ کرنا، نفرت اور بے زاری بھی منظور نہیں کہ اماں کا لاڈلا ہوں۔ یہ توجہ، خطوط، بے شرط و بے حد محبت منظور نہیں تو سیدھے بولنا۔ راہ الگ ہی رکھنا۔ یہ محبت کی شرائط نہ تھیں۔ طرز دنیا داری ہے۔ میری محبت، تمہاری ہاں سے مشروط نہیں۔" وہ ناخن چبانے بیٹھ گئی۔

رات کو ابا آئے تو ساتھ دو کلو سوہن حلوہ بھی تھا۔

"یہ شریف حلوائیوں کا لڑکا دے گیا۔ کہتا تھا منت مانی تھی۔ میں نے کہا بھی چھوٹے کو کہہ سب کو دے، بھول گیا شاید۔" سائرہ نے معنی خیز سا گھورا۔

"ہائے ابا۔ پتا بھی ہے کتنا مہنگا ہے شریف محل والوں کا سوہن حلوہ۔ یہ لمبی قطاریں ہوتی ہیں خریداروں کی۔" سائرہ نے سر دھنتے ہوئے کیا کمرے میں آ کے سکینہ سے بولی۔

"سر پھرا ہے ناں۔ لڑکی نے کھری کھری سنائیں اور وہ..... کیا ارادہ ہے سکینہ؟ سچ بتا۔"

"سچ کہوں تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، نہ ہاں ہے نہ پوری ناں۔ کچھ وقت گزرے تو شاید بہتر فیصلہ ہو سکے۔" گیہوں کا بنا وہ حلوہ اسے دنیا کی خوش ذائقہ ترین شے لگا تھا۔

☆☆☆

وقت مستقل مزاجی سے گزرتا رہا۔ بہار اتر آئی لاہور پر۔ موسم کے تیور نرم پڑ گئے۔

مرتضیٰ امجد بڑا سخت جان نکلا۔ جانے سکینہ عبدالقیوم کے نصیب کن پروازوں پر تھے، جب مرتضیٰ امجد کی نگاہوں نے اسے پایا تھا۔ وہ جامعہ نہ جاتی تو مرنے کو ہو جاتا۔ جی داری سے گلی میں آ کھڑا ہوتا۔ کسی بچے کو برفی تھماتا اور وہ سکینہ کا دروازہ بجاتا۔ وہ دروازہ کھول دیتی۔ مرتضیٰ دیکھ لیتا۔ سانس لے لیتا پھر مڑ جاتا۔ جامعہ جاتی تو رستوں پہ آنکھیں نصب کر دیتا، شریف محل کی اینٹ اینٹ اشتہاروں سے رنگوا دی۔ جامعہ پنجاب والوں کے لیے لالچ سے بھری ترغیبات، وہ مسکراتے ہوئے وہاں سے

گزرتی۔ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوتی ہر زاویے سے خود کو پرکھتی۔ ''عام..... فقط عام'' کا جواب آتا۔

مرتضیٰ سے پوچھ لیتی تو وہ بھی بتا نہ پاتا کہ سکینہ کیا ہے۔ وہ ایک خط کا جواب لکھتی۔ وہ چار خطوں میں جواب لکھتا۔

وہ رکشے میں سوار ہوئی ہی تھی کہ وہ ساتھ آ کے بیٹھ گیا۔ گھبرائی۔

''میں اتر جاؤں گی قسم سے۔'' وہ ہنسا۔

''کچھ نہیں کہتا..... بات کرنی تھی بس۔'' وہ بے بسی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''اماں سیدھی سادی ہیں۔ ابا پکے حلوائی۔ تہبند اور شیرہ بس۔ چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں۔ سر پر ابا کے خواب، کندھوں پہ اماں کے مان اور پہلو میں بہنوں کی فرمائشیں لیے چلتا ہوں۔ کچھ عرصے سے پریشان کر رکھا ہے اپنے خاندان کو۔ مجھے لگتی گھن ماں بہنوں کو نظر تو آ گئی ہوگی۔ اماں کے وظیفے بڑھ گئے ہیں۔ بہنوں کے شکوک اور میرا لطف بھی۔ اب تو ابا بھی کھانا گھر پر کھانے لگے ہیں۔ مجھے بغور دیکھتے ہیں۔ میری وکالت کے دو درجے رہ گئے ہیں بس۔ اماں کو خبردار کر دینا مناسب لگتا ہے کہ میری پھوپھی جان کے چکر روز لگنے لگے ہیں۔ ادھر خالہ بھی واری صدقے ہیں۔ کیا کہتی ہو؟''

وہ بس اپنی فائل دیکھے گئی۔

''اگر تم نے کبھی سبھاؤ سے راہ چنی ہوتی تو میں بیٹھا تم سے اجات نامہ نہ لکھوا رہا ہوتا۔ کہو تو بات چلاؤں؟''

''دیکھو، میں بہت ہی عام لڑکی ہوں۔ ڈھنگ کی ہانڈی تک بنانی نہیں آتی۔ یہ جو کلف لگے کپڑے پہنتے ہو تم، مجھے تو کلف پکانی تک نہیں آتی۔ دبتا رنگ ہے میرا۔ بال تھوڑے کھردرے سے۔ ہاتھوں کے ناخن بڑھتے ہی نہیں اور نیل پالش لگاتے اتنا کانپتے ہیں کہ ہاتھ اور بھدے لگنے لگتے ہیں۔ ابا پتا نہیں مانیں نہ مانیں۔ پھر تمہاری اماں کو پسند آ بھی گئی تو چھ بہنوں کے معیار..... تم ملو گے نہیں۔ تحقیر سود سمیت مل جائے گی۔''

مرتضیٰ امجد کو اتنے سچ کی امید نہ تھی۔ پہلے چپ ہوا پھر بے ساختہ ہنسا۔ جامعہ پنجاب کی گیٹ نمبر چار پہ اترتے بھی وہ اسے آنکھ کا پانی جھٹکے دیکھتی رہی۔ وہ ہنس رہا۔ یہ ناراض ہو گئی۔

☆☆☆

جامعہ کے لیے نکلا تھا ان ہی قدموں گھر واپس آ گیا۔ بڑی بہنیں کاموں میں مصروف..... چھوٹی اسکول و کالج۔ اماں محلے میں گئی تھیں۔ وہ فائل رکھ کر ٹہلنے لگا۔ سوما، اماں کو بلا لائی۔ اماں بیٹے کا چہرہ دیکھتے دہل گئیں۔

''سوما، بھائی کے لیے پانی لا۔ واپس آ گیا میرا شیر۔ اللہ خیر کرے۔'' سوما کا پانی مرتضیٰ نے دیکھا تک نہیں۔ آنکھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

''اماں گلی نمبر ایک کی سکینہ پسند ہے مجھے۔''

اماں سکینہ کو خاک جانیں مگر وہ اسے گلی نمبر ایک کی لڑکی کبھی نہ کہتا۔

''پسند کیا..... بس وہی چاہیے زندگی بھر کے لیے۔ ابا سے بات کرو۔ اسی ہفتے رشتہ لے کر جاؤ میرا۔'' اماں کے ہونٹ سفید پڑ گئے۔

''سوما! پانی.....''

عام سی ہے لوگوں کے لیے۔ مگر کردار، شرافت، اطوار کی قسم میں کھاتا ہوں۔

میرے لیے..... وفاداری، صبر اور استقامت ہی کافی ہے۔ بس..... لے جاؤ رشتہ۔''

فائل تھامے باہر نکل گیا اور اماں..... سرد ہو گئی تھیں۔ ''کوئی ان کا لال لے اڑی تھی۔ یہ بغل میں گلی نمبر ایک کی سکینہ.....'' وہ بڑبڑانے لگیں۔

☆☆☆

جب سکینہ نے اس چٹ پہ لکھا دیکھا تھا۔

''اماں سے کہہ دیا ہے۔ اس ہفتے گھر اچھا سا صاف کر لینا۔ چہرہ ایسا ہی بھلا۔ نیل پالش تو بالکل نہ لگانا۔'' وہ ہنس دی یقیناً لکھتے ہوئے وہ بھی مسکرایا تھا۔ پڑھا تب وہ گھر میں داخل ہوا۔

بہنوں کی جماعت باورچی خانے کی کھڑکی سے چپکی کھڑی تھی۔ نیم کے پیڑ تلے رکھی چارپائی پہ وہ کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ اماں کھانا لے گئیں۔ خاموشی سے اس کو کھاتے دیکھتی رہیں۔ برتن ربیعہ کو تھما کے مڑیں۔ پیار سے بیٹے کے بال سہلائے۔ پیشانی چومی۔

''میرا بچہ...... میرا شیر...... میری آنکھوں کا نور۔'' وہ مسکرایا۔

''تیرے ہوتے کبھی دوسرے بیٹے کی خواہش نہ کی، میں نے کہ رب کو شکوہ برا نہ لگ جائے۔ تیری نظر توڑ کے تعویذ گھر کے ہر کونے میں دابے ہیں۔ سیروں مرچیں پھونک ڈالیں۔ کوئی دربار، مزار...... کوئی تہجد نہ چھوڑی بھی۔ یہ کیا بول گیا ہے تو سویرے مجھے، بہنیں الگ روہانسی ہوگئی ہیں میری جان۔'' ماں کے ہاتھ تھامے اور بولا۔

''یہ میرا بچپنا نہیں ہے اماں۔ نہ ہی میری جوانی مذاق ہے۔ ایک بار دیکھ لو، مل لو۔''

''تیری پھپھی راجیہ کو تیار کیے بیٹھی ہے۔ ادھر بتول کی رودابہ بھی لاکھوں میں ایک ہے۔ جگہ نہیں نکلتی بچہ۔ لڑکی دیکھی آج جا کے میں نے۔ شکل تو ہماری بچیوں جیسی ہے، اچھی ہے۔ پر بچہ نہ سر پہ ماں...... نہ ذمہ دار باپ۔ تایا زاد بہنوں کے قصے پورے محلے میں مشہور۔ باپ کے ہوٹل کے کھانوں پہ پلی ہیں لڑکیاں۔ سلیقہ تو سرے سے ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر سب سے بڑی بات جب بہتر رشتے موجود ہوں تو......''

''جس دن جانا ہو، سکینہ کے ہاں، بتا دیجیے گا۔''

وہ اماں کی پھرتی پہ حیران ہوا تھا۔ اسی قسم کے مباحثوں کی توقع تھی اسے۔ ارادے چٹان کر رکھے تھے اس نے۔ اماں نے تاسف سے بیٹے کی پشت کو دیکھا پھر فیصلہ کن انداز میں اٹھ گئیں۔ لڑکیاں یاں سے پوچھنے بھاگی آئیں۔ منگولوں سی تنی اتر آئی تھی ان سب کی آنکھوں میں۔

☆☆☆

''ثانی! تیرا بھائی بیمار ہے کیا؟ آج مجھے ہمیشہ جیسا نہیں لگا۔'' ام ثانی سب سے چھوٹی بہن تھی مرتضیٰ کی۔ دسویں جماعت کی طالبہ۔ دوستیں اس کے بھائی پہ بڑی نثار تھیں۔

''بیمار نہیں ہیں، تھکے ہوئے ہیں۔ جنگ لڑ رہے ہیں گھر میں۔ کسی کو بتانا مت۔ وہ گلی نمبر ایک کی سکینہ عبدالقیوم......''

ثانی نے سب کہہ سنایا۔ مقابل زبان داب گئی کہ وہ ہمسائی تھی سکینہ کی۔

''تم لوگوں نے خود دیکھے تھے وہ خطوط۔''

''ہاں ناں۔ اماں نے بھائی کا کمرہ چھانا تھا پہلے دن ہی۔ یہی کوئی تین چار خط تھے اس کے۔ ادھر اُدھر کی باتیں لکھی تھیں، بچپن کے قصے، مٹھائیوں کی ترکیبیں۔'' وہ ہاتھ ہلاتی، چاٹ کھاتی جاتی۔ جبکہ سکینہ کی ہمسائی چٹخارے لیے جاتی پھر کیا تھا، رات ہونے تک محلے کے تین گھروں کو خبر ہو چکی تھی۔ اب کنڈلیاں کھلنے لگیں۔

''بھئی ''شریف محل'' والوں کا لڑکا کچھ عرصے سے آنے لگا تھا محلے میں......''

''ارے سر پہ مائیں نہ ہوں تو......''

''بھئی مجھے تو یقین نہیں۔ خاصی سمجھ دار لڑکیاں ہیں وہ۔''

اماں چپ تھیں۔ مگر ابا بھڑک اٹھے تھے۔ مرتضیٰ نے سرسری سا گھر والوں کی مزاحمت کا بتایا تھا اسے بس۔

''مجھے بیٹیاں بھی بیاہنی ہیں۔ ہوش کرو بیٹا جی۔ کون لے گا ایک عاشق کی بہنیں۔ پھر آپا تو وٹہ سٹہ پر بھی مانتی ہیں تیرے لیے۔''

''آپ مجھے عاشق نہ بنائیں، شوہر بنا دیں۔ مسئلہ ہی ختم۔ بہنوں میں کیا کمی ہے جو میرے بدلے میں کوئی انہیں مانگے۔ مجھے اپنی بہنوں کو محرومیاں نہیں دینی جہیز میں۔''

بحث برائے بحث ہوتی۔ کوئی جیتتا نہ تھی بس فاصلے چھیدوں پر قبضہ کیے جاتے۔

☆☆☆

PakDigestNovels.Com

ادھر بات خالہ تک پہنچ گئی۔ پہلا تیر ادھر سے ہی چلا۔ سائرہ ان کے گھر آئی تھی، کسی رشتے دار کی بیٹیوں کے رشتے زیر بحث تھے۔

"زمانہ نسوار نہیں لیتا بنو! رشتہ آنے سے پہلے بدنامیاں محلوں میں آجائیں تو لڑکیوں کے نصیب پہ مہریں لگا جاتے ہیں۔" وہ ٹھٹکی۔ خالہ کا لہجہ...... اور سائرہ کا کہنا۔

"کوئی نہیں خالہ! ماں زندہ ہونی چاہیے بس...... مہریں چاہے جیسی بھی ہوں، مائیں کھول ہی دیتی ہیں۔" خالہ زہر زہر ہوگئیں۔

"ہونہہ...... یہ ذوبیلہ! کیسے دھواں دار خطوط لکھا کرتی تھی زبیر کو اور اب خالہ کی فلاسفیاں تو دیکھو۔"

واپسی پہ آتے سائرہ کلستی رہی۔ سکینہ کا سکون اس دن ختم ہوگیا۔

پھر کسی دن سکینہ سبزی لینے نکلی تو......

"سکینہ! یہ کیا سن رہی ہوں میں۔ اللہ بخشے تیری ماں سے بڑا بہناپا تھا میرا۔ ہر بات میں، ہر کام میں ہمارا اکا ہی ہوتا۔ تم لوگ تو پڑھائیوں میں ایسی مصروف ہوئیں۔ خیر...... میری ثمن کی سہیلی ہے، یہ شریف محل والوں کی چھوٹی لڑکی۔ جانے کیا کیا بول رہی تھی اس دن اسکول میں اپنے بھائی کو لے کر۔ میں نے تو کہہ دیا ثمن کو، خبردار جو قریب گئیں اس لڑکی کے۔ سکینہ، سائرہ پہ تو سارا محلہ فخر کرتا ہے کہ ماں مرگئی، بڑی بہن سترہ سال کی عمر میں ہی بیاہی گئی۔ کیسا گھر سنبھال رکھا ہے دونوں نے اور باپ کو تو ہر طرح سے ٹھنڈ ہے، بکواس کرتے ہیں لوگ......"

سکینہ دروازے پہ گوند ہوگئی۔ خالدہ خاتون بول بال یہ جا وہ جا...... مرتضیٰ کا خط آیا تو سکینہ نے کھول کر نہیں دیکھا۔ بین الاقوامی تعلقات کی کتابیں ہل ہل کر پڑھتے بھی وہ بے سکونی کو اپنے اردگرد پاؤں پسارتے دیکھتی رہی۔

سائرہ مثالیں ڈھونڈتی رہی۔

"یہ خالدہ خالہ اتنا وعظ سنا رہی تھیں۔ یہ عظمیٰ کو ہر میلاد میں، ہر تقریب میں اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ بہانے بہانے سے مردان خانوں میں دھکیلتی ہیں اور لڑکوں کی ماؤں کو پانی، سلاد کھیر، فرنی اپنی بیٹی کے ہاتھوں پہنچواتی ہے۔ یہ کرتے شرم نہیں آتی تو بیٹی کی سہیلی کی بات پہ بھاگی آئیں احوال پوچھنے۔"

سکینہ لب کاٹتی رہی۔

اگلے دن ثریا آپا آگئیں۔

"سانس گھٹ رہا تھا۔ اتنے دن ہوگئے تھے، سوچا مل آؤں۔"

وہ مصروف رہی۔ شام کو جمیلہ، ذوبیلہ آگئیں۔ باتیں، قہقہے، کھانوں میں وقت اچھا گزرا۔ آپا بولیں۔

"جنید آتا ہے تو شریف والوں کا گاجر کا حلوہ منگواتے ہیں۔"

"ارے نہیں بھئی، بڑے مہنگے ہیں یہ لوگ۔" سکینہ نے لاپروائی سے کہا۔

"چھوڑو بھئی۔ اب کاہے کے مہنگے۔ آج کل تو بڑی دھوم مچی ہے ہر طرف۔" ذوبیلہ نے آنکھ دبائی۔ جمیلہ کی کہنی نے ذوبیلہ کو تنبیہ کرائی اور سکینہ جامد ہوگئی۔

کیا تھا اس عام سے عمل میں۔ تحقیر اڑاتا مذاق...... پشیمان کردیتے اشارے...... بے توقیر کردیتے جملے...... سکینہ عبدالقیوم تھی وہ...... بس ہوگئی اس کی۔ سب گھروں کو لوٹ آئیں۔

فروری کی وہ شام سائبیریا کی عادات لیے اتری۔ ابا سائیکل پہ واپس آئے۔ مونچھیں، بھنویں، داڑھی...... کہر سے ہلکی سفیدی سی ہورہی تھیں۔ سائرہ سوگئی تھی مگر وہ معمول کی طرح ابا کا انتظار کرتی۔ ابا سردی سے شل ہورہے تھے۔ کپکپی نہ رکتی تھی۔ اسے ابا کمزور اور بوڑھے لگے۔

"ابا اب روز مت جایا کریں ہوٹل۔ کسی کے حوالے کردیں۔ کبھی کبھار چکر لگالیا۔"

"کوئی بیٹا ہوتا تو شاید یہی کرتا۔ دو بن بیاہی بیٹیاں ہیں میری۔ محنت کروں گا تو ہی لوگوں کی

PakDigestNovels.Com

فرمائشیں اور بیٹیوں کے ارمان پورے کروں گا ناں۔ ثریا بانو کا دکھ مجھے ادھ موا کرتا ہے۔ تم لوگوں کو کسی آزمائش میں نہ ڈالوں گا۔ آگے تم لوگوں کی قسمت۔ بڑی نیک بیٹیاں ہو میری۔ ہوٹل جاؤں تو گھر کی فکر نہیں ہوتی۔ گھر میں ہوں تو تالے لگانے کی فکر نہیں ہوتی۔ تمہاری ماں کا بڑا دین دار ہوں میں ہر معاملے میں۔"

وہ نادم سی ابا کو سنتی رہی۔ اگر ابا کو پتا چلے کہ میں..... گردن میں گلٹی ابھرتی۔ دل بیٹھ جاتا۔ یہ کیا ہوگیا مجھ سے..... بستر پہ لیٹی تو.....

"جب اس سے محبت کا دعوا نہیں، شادی کروانے کا جنون بھی نہیں تو پھر چار خط لکھ کر لوگوں کو کون سا ثبوت تھما دیا میں نے۔" خود پہ حیران ہوئی۔

وہ ناقابل بیان سی کیفیت..... خط لینے سے لے کر پڑھنے اور پھر لکھنے تک کی۔

یہ گلی کے لوگ جن کے نام تک پورے نہیں آتے مجھے۔ آج یہ لوگ مجھے آتے جاتے دیکھ کے اشارے کرتے ہیں۔ کل اپنی بیٹیوں کو ہمارے گھر نہ آنے دیں گے۔ ذوبیلہ میٹرک فیل لڑکی کیسے کہا کرے گی۔

"ارے کوئی ضرورت نہیں لڑکیوں کو پڑھانے کی۔ پڑھ لکھ کر بھی تو انہوں نے خط ہی لکھنے ہیں۔ کیا کرلیا سکینہ عبدالقیوم کے ایم۔اے سیاسیات نے۔"

شدید ٹھنڈ میں بھی سکینہ بستر سے ننگے پاؤں نکل آئی۔ چہرے پر ہاتھ پھیرتی، گردن سہلاتی۔

لوگوں کی کتابوں میں میرے نام کے آگے معاشقے لڑانے والی لکھا گیا اور میں ان کاغذ میں لکھے لفظوں کے فریب کو نہ سمجھ سکی۔

یہ سامنے کے نتائج مجھے نظر کیوں نہ آئے۔ میرے خدایا۔

میرے ابا..... پڑھی لکھی، شریف، سمجھ دار بیٹیوں کے ابا..... یقین کرنے والے۔

"ارے ماں تو مرگئی ان کی۔ کیا باپ اندھا ہے؟ اسے اپنی بیٹی کے بدلتے رنگ ڈھنگ نظر نہ آئے۔ لوگ یقیناً میرے ابا کو تو یہی کہتے ہوں گے۔

کھڑکی سے باہر پورا لاہور سیاب تالاب بنا بیٹھا تھا۔ اندر بیٹھی سکینہ اپنے لکھے خط ذہن میں کھنگالتی۔

"کسی ایک میں بھی نہیں تھا کہ مجھے اس سے محبت یا اس جیسا کچھ ہے۔"

کوئی رومانوی جملہ، اکسا تا خیالا..... لبھاتی ادا کچھ بھی نہیں تھا ان میں..... بس باتیں، یادیں، وہ اس کا سامع تھا بس۔

پھر رات نے کھڑکی کے جھروکے سے لگ کر دیکھا کہ سکینہ عبدالقیوم نے کاغذ کے وسط میں لکیر کھینچی۔ جیسے دل کے دو حصے کردیے ہوں۔ وہ لکھنے لگی، فوائد کے خانے میں۔ یہ تعلق توڑ دینے کے فوائد، کچھ یوں تھے فوائد۔

"خالہ! میرے نصیب کو مہر زدہ نہ کہہ سکیں گی۔ ذوبیلہ کو فخر کرنے کو کچھ نہ ملے گا اور بجیلہ کو کہنی مارنے کو۔ میرے ابا کو دیکھ کے کوئی اشارہ نہ کرے گا۔ اچھا یہ ہے عبدالقیوم اس لڑکی کا باپ۔ میں ابا کے سامنے نظر اٹھا کے پھر سے باتیں کیا کروں گی۔ ذوبیلہ، بجیلہ کو دیکھ کے میرے ہونٹ خشک نہ ہوا کریں گے۔ سبزی لینے جاؤں گی تو کوئی روک کے تفتیش نہ کرسکے گا۔ محلے والوں کی چٹخارے لینے کی جرأت نہ ہوگی۔ جو کوئی بھی نصیب میں ہوگا اسے سینہ پھلا کے کہوں گی کہ پہلی محبت سے آخری شراکت داری صرف تم سے ہے۔ اپنی اولاد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے انہیں بے راہ روی سے روک سکوں گی۔ انہیں کوئی نہ کہہ سکے گا کہ "جا تیری تو اپنی ماں....." میں فخر سے لوگوں کو کہہ سکوں گی کہ بیٹیوں کو تعلیم دلاؤ کہ تعلیم ہی بدلاؤ کی طرف پہلا قدم ہے۔"

فوائد کے بعد خسارے کا خانہ دیکھا تو صرف ایک خسارہ نکلا۔ فیصلہ ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ ضمیر کی اس عدالت میں ہر شے کا فیصلہ دل کے خلاف تھا۔ دل پہلے بودے دلائل دیتا رہا پھر چپ ہوگیا۔ عدالت کے فیصلے میں با آواز بلند کہا گیا۔

☆☆☆

غلامان عشق گھونپتے ہیں خنجر اپنے ہی پہلو میں
غلامان عشق دیتے ہیں فوقیت عزت کو، محبت پہ

اخیر فروری کا چمکتا سا دن تھا وہ۔ سکینہ عبدالقیوم نے مرتضیٰ امجد کے خطوط گنے۔ تیرہ خطوط کو لفافے میں ڈالا۔ سائرہ کو بے خبر رکھا۔ پھر نکلی وہ اپنے دوسرے عشق کے رستے پہ۔ شریف محل سامنے کھڑا تھا۔ کاؤنٹر پار امجد شریف صاحب تھے۔

"مرتضیٰ امجد ہیں تو انہیں بلا دیں۔"

مرتضیٰ کے باپ نے تحیر سے اس لڑکی کو دیکھا۔ بالائی منزل پہ مصروف مرتضیٰ ہوا سے ذرا ہی کم رفتار میں نیچے آیا۔ دلکش سا مسکرایا۔ زیر لب بڑبڑایا۔ وہ نہ مسکرائی، بات شروع کی۔ امجد شریف اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئے۔

"سوہن حلوہ میٹھا ہے آپ کا۔" چھوٹا مرتضیٰ کے اشارے پر سوہن حلوے کی ٹرے اٹھا لایا تو وہ شروع ہوئی۔ "بہت میٹھا..... اتنا کہ اس پر بھنبھناہٹیں ہونے لگی ہیں۔ ماں نہیں ہے میری۔ ابا مان کرتے ہیں ہم پر۔ دنیا جلد باز ہے..... رائی دیکھتی، پہاڑ گھڑ لیتی ہے۔ میں چونکہ لڑکی ہوں تو مجھے محبت ہو نہیں سکتی۔ ہونی نہیں چاہیے ناں..... بس شادی ہونی چاہیے۔ خط آنے کے بجائے رشتہ آنا چاہیے، مجھے پہلے خط آ گیا۔ اس الٹی ترتیب نے ہر اچھائی کو گناہ میں بدل دیا۔ بہتان باندھتی سرگوشیاں شاید..... میں اہل نہیں ہوں انہیں سننے کی۔ تو..... میں نے رات دو خانے بنائے، فوائد اور خسارے کی فہرست بنائی۔ حیرانی مجھے کھا گئی کہ فوائد بے انت نکلے اور نقصان صرف ایک۔"

"اکلوتا نقصان کیا ہے۔" مرتضیٰ امجد نے انہونیوں کی سرگوشی پالی۔

"اس لین دین کو چھوڑ دینے کا نقصان یہ کہ بس تم نہ ہو گے، کہیں بھی نہ ہو گے۔"

"بس....." وہ بے بس ہو گیا۔ امجد شریف کے ہونٹ چپک گئے۔ چپ.....

"چلو میں دو خانے بناتا ہوں۔" مخالفت پر اترتا اپنا بیٹا انہیں دیوانہ لگا۔ "فائدہ کوئی نہ..... کائنات کی کوکھ کا ہر خسارہ میرا۔"

ابا کے حساب کتاب کے رجسٹر پر لکیر لگی۔ وہ ساکت کھڑی رہی۔ اس کے حساب میں مرتضیٰ کب تھا۔ فقط وہ خود ہی تھی۔

"چلو، ترتیب بدل دیتا ہوں۔ رشتہ بھیج دیتا ہوں۔ خط بعد میں۔" وہ اپنے خطوط والا لفافہ ہاتھ میں لیتا ہوا بولا، سکینہ چیخ گئی۔

"پھر ہر شے بدل دو۔ میرا ضمیر، میرا باپ..... اپنی بہن کی سہیلی، معاشرے کی سوچ۔ مرتضیٰ! وقت گزرے گا تو ہر فہرست نئی بن جائے گی۔ نئے لوگ، نئی فہرست۔ تمہیں نہ چھوڑا تو میرا نامۂ اعمال بدل جائے گا۔ میری غلطی ہے، گناہ نہیں بنانا اسے میں نے۔ مجھ سے میرا باپ نہیں دیکھا جاتا۔ ان کی سفید داڑھی..... جھکے کندھے۔ مرتضیٰ امجد! میرا باپ میرا پہلا عشق ہے۔ کہا تھا ناں کہ میں اپنی ماں جیسی ہوں۔ مجھے کل رات یقین آ گیا کہ جن بیٹیوں کو باپ کے چہرے کی لکیریں گننے اور ان لکیروں سے محبت کرنے کی عادت پڑ جائے وہ محبت کے لیے انتہائی ناموزوں ہوتی ہیں۔"

وہ رکی پھر دھیمے مگر مضبوط لہجے میں بولی۔

"خدارا یہ مقناطیس ہٹا دو مجھ پر سے۔ مت کھینچو ان الفاظ کے بل پہ مجھے۔"

وہ بیانیہ پڑھتی غیر ملکی سفیر دکھتی۔ سپاٹ، سرد، مضبوط۔

مرتضیٰ امجد اس سورج کے نکلنے کو ملامت کرتا یا دنیا کے رواں رہنے پر بین۔

بہرحال فروری کا وہ دن اس کی محبت نگل گیا۔ وہ تیرہ خطوط ہاتھ میں تھامے سکینہ عبدالقیوم کی اٹھی، بے لچک گردن کو دیکھتا رہا۔ عجب سناٹا تھا جب وہ اٹھ کے گئی۔ سوہن حلوے کی ٹرے گرنا، چھوٹے کا بھاگنا،

ابا کا چلانا، وہ وحشی سناٹا نگلتا گیا ہر زندہ شے کو۔
اب جو دل آواز سے چلتا تھا، سناٹے کی زد پہ تھا۔

☆☆☆

رستہ تھا کہ فرعون مصر کی بنائی بھول بھلیاں۔ وہ بھٹک بھٹک جاتی۔ گلی نمبر دو رستہ مڑ جاتی اور گلی نمبر چار میں جا نکلتی۔ وہاں سے چلتی تو واپس انارکلی۔

''اے ضد پہ اتر آنے والے راستو! کیا چاہتے ہو مجھ سے؟ اس جرأت کو میرے لیے سوختہ جاں بنانے پر کیوں تل گئے ہو۔ مجھے واپس جانے دو خدارا..... واپس جانے دو۔'' بڑبڑائی جاتی۔

گھر آ کے منہ چھپانے کو لحاف ہی میسر تھا۔ سائرہ کو بتایا تو وہ بلا مبالغہ دو گھنٹے بولی سکینہ کے فیصلے کے خلاف۔ وہ لوگوں کی مثالیں ڈھونڈ لانے میں کمال رکھتی تھی۔ خاندان، برادری، محلہ، سہیلیاں..... وہ ہر طرف سے مثال لائی۔ بالآخر وہ بولی۔

''سائرہ ..... ذوبیلہ اس کی ماں زندہ تھی۔ ماؤں کی اوڑھنیوں میں بڑی وسعت ہوتی ہے۔ زمانے کے تیر اوڑھنیاں چھید کر اولاد کو نہیں پا سکتے۔ ماؤں کا بس چلے تو کراماً کاتبین کا حساب بدل دیں۔ منکر نکیر کے ہر سوال کا جواب اولاد کو رٹوا دیں۔ میری ماں نہ تھی۔ میرے نصیب میں یہ تفریح نہ تھی بس۔''
پھر شرمسار سی بولی۔

''ذوبیلہ کے خط ..... مہک کی ملاقاتیں..... سجیلہ کی محبت کی شادی..... خدارا بند کرو یہ مثالیں لانا۔ اللہ کو بری لگتی ہے عیب جوئی والی گفتگو۔ ہم تو اچھی لڑکیاں تھیں..... پھر مجھے کیا ہو گیا؟ اللہ نے کسی ایسے ہی پچھتارے کے بدلے میں پکڑ کی ہے میری۔ بیٹھے بٹھائے، ڈیڑھ ماہ کے اندر محلے میں، خاندان میں مشکوک ہو گئی ہوں میں۔ نظریں اٹھاتے اٹھاتے بھی سالوں لگ جائیں گے حالانکہ تم گواہ ہو کہ کیسے خط لکھے تھے میں نے۔ پکڑ ہوئی ہے میری۔ ایسی گفتگو ہماری زبانیں پھر کبھی نہ دہرائیں۔ توبہ لازم ہو گئی ہے۔''

آنکھوں کی آبشاریں یکا یک پرجوش ہو گئیں۔ سکینہ عبدالقیوم ڈھائی گھنٹے روئی تھی اور بس مرتضیٰ امجد کا عکس دھل دھلا گیا۔

مرتضیٰ چھوٹ گیا تھا۔ لاہور یونہی ہنستا تھا۔ چلتا رہتا تھا۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔ چلنے لگی۔ ایک دن.....

کوئی تین ماہ بعد داتا دربار کی پچھلی گلی میں آتے، اسے نظر آیا تھا وہ..... مفلوک الحال..... خواب آلودہ شکستہ شخص۔

پھر مرتضیٰ کو وہ نظر آئی تھی سپاٹ و بے رونق عورت۔ وہ دائیں بائیں، آگے پیچھے دیکھنے لگا۔ ''کہاں جاؤں۔'' والی افراتفری یکا یک پیچھے مڑا اور بھاگتے قدموں سے چلنے لگا۔ جدھر سے آیا تھا وہیں چلا گیا۔

دوسری اور آخری بار سکینہ کو ویگن میں ملا۔ ناصر باغ سے طلبہ کا ہجوم سوار ہوا تو وہ بھی ہمراہ تھا۔ چلتی ویگن پہ بھاگ کے سوار ہوا۔ پہلی نظر ہی سکینہ پر پڑی۔ چلتی سے ہی اتر گیا۔

کنڈیکٹر نے موٹی موٹی گالیوں سے نوازا۔ کئی ایک نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ سکینہ ساکت رہ گئی۔ گویا دکھ ختم شد..... نفرت درآمد است..... پھر اس نے کبھی مرتضیٰ امجد شریف کو نہ دیکھا۔

☆☆☆

لوگوں کا ''انصاف'' نہ ماضی کی پاک بازی دیکھتا ہے، نہ مستقبل کی توبہ۔

سکینہ عبدالقیوم نے اچھا اور نیک بننے کو ایک فیصلہ کیا..... قائم رہی۔ لوگوں نے اور کچھ ڈھونڈنے کی بھرپور کوششیں کر ڈالیں اور مایوس ٹھہرے۔

ذوبیلہ بڑے فخر سے کہتی۔

''خیر..... اس دنیا میں اتنا پاک دامن تو کوئی بھی نہیں۔'' سکینہ کا دل کٹا جاتا۔

''اور کتنے پاک دامن ہوں تو دنیا مانے؟'' سائرہ کہتی۔

''اب بیٹھی رہو کنواری ساری عمر۔ خالہ کو ہماری عمریں نظر نہیں آتیں، بس اپنے گھٹنوں کا درد پیارا

ہے۔ابا کو ویسے بڑی شرم آتی ہے کسی کو کہتے۔عام سی شکل، اوسط درجے کا گھرانہ..... وہ مرتضیٰ امجد ہی تھا جو کوہ قاف سے راستہ بھٹک کے گلی نمبر ایک کی سکینہ پر مرمٹا تھا۔"

☆☆☆

سکینہ کا ماسٹرز مکمل ہوا۔ لیکچرار کا امتحان پاس کرلیا۔ کوئن میری کالج میں پڑھانے لگی۔ عمر ہوگئی پچیس..... پھر چھبیس۔ ان ہی دنوں قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد نے ایم۔فل سیاسیات کی ڈگری کا اعلان کیا۔ لاہور کی رواں زندگی سے نالاں سکینہ کو نئی روشنی مل گئی۔

ایم۔فل نے مفتوح کرلیے سکینہ کے حواس۔ ارادے اور خوف بھی۔ ڈگری لیتے لیتے ڈھائی سال مزید بیت گئے اور وہ ہوگئی ساڑھے اٹھائیس کی۔ اب ابا بھی فکرمند نظر آنے لگے تھے۔

تایا اور خالہ آئے۔ سائرہ کو انگوٹھی پہنا گئے۔ پھر شادی پر زور شروع ہوا تو ابا مزید ہونق ہوگئے۔ سر پر نکلے چار سفید بالوں نے سکینہ کو ہولائے رکھا اور پھر.....

"انگریزی زبان ہے سر! ذہانت ماپنے کا آلہ نہیں۔ علم کو انگریزی میں رنگنے سے اس کی اثر پذیری متاثر ہوتی ہے تو فقط اتنی کہ لاہور کی پچھتر فیصد آبادی جو آپ کی بات سمجھنے کی اہل ہے۔ قطعی بے بہرہ ہوجائے گی اپنے وراثتی علم سے۔ یہ پچھتر فیصد آبادی اس زبان کو سیکھنے میں اتنی محو ہوجائے گی کہ علم کی اصل روح مردہ ہوجائے گی۔ اس لیے درخواست ہے کہ اپنے اساتذہ کو اس احساس کمتری سے نکالیے کہ انگریزی کو سیکھنا ان کے طلبا کے لیے کامیابی کی کنجی ہے۔" پنجاب یونیورسٹی میں ہونے والے مباحثے میں وہ چیخ چیخ کے بولتی۔ تیسری قطار میں بے زاری سے بیٹھے شخص نے دلچسپی سے اس سادہ سی لڑکی کو دیکھا۔

"اچھی سن میں کیمسٹری پڑھاتا ہوں۔ شاید ہی کوئی لفظ اردو کا کبھی بولا ہو۔ اردو سننا تو اب پشتو خبریں سننے جیسا لگتا ہے۔ آج مزا آیا ہے۔ اچھا لگتا ہے اپنی زبان کو فخر سے آگے لانا۔ دراصل مجھے اچھا لگے گا آپ سے رابطہ رکھنا۔ آپ سے دوستی نیک مطلوب چاہتا ہوں۔"

سکینہ بے ساختہ ہنسی۔ خاور شیر زمان اس ہنسی کا دیوانہ ہوا۔

"آپ کی اردو پر تو محنت کرنی ہوگی۔ دوست سے زیادہ استاد بننا ہوگا۔" وہ دامن بچا گئی۔

پھر کتنے ہی دنوں بعد خاور شیر زمان کی ڈاکٹر بھابھی کے رشتہ لانے پر وہ دنگ رہ گئی۔

"اچھا..... وہ خاور شیر زمان..... یاد آ گیا۔"

اور پھر وہ سکینہ خاور شیر زمان بن گئی۔

☆☆☆

غلامان عشق آزمودہ نسلوں کے تسلسل وقار میں غلامان عشق گھپاؤں میں رستہ بتاتے ابابیل ہیں

خاور شیر زمان معاشرے کے اونچے ترین طبقے کا پروردہ تھا۔ جدیدیت کا دلدادہ، روشن خیال اور بلند عزم۔ سکینہ کو اکثر کہتا۔

"جانے وہ کیا شے تھی جس نے مجھے تم سے شادی پر مجبور کیا۔" وہ مزید نثار ہوجاتی۔

لاہور کا مہنگا ترین رہائشی علاقہ، مہنگا ترین گھر، بہترین لباس۔ سائرہ اور ثریا آپا قسمت کی یاوری پر حیران ہوتیں۔ خالہ نے سائرہ اور جنید کو شادی کے بعد ابا کے گھر ہی رہنے دیا۔ پھر گھروں کے درمیان کی دیوار گرادی تو سب کو آسانی ہوگئی۔

فقط دو ماہ میں سکینہ کو خاور سے محبت ہوگئی تھی۔ لامشروط نہ سہی۔ بے حد محبت ضرور۔ خاور کے لباس کی خوشبو، ابرو اٹھانا..... بالوں کو انگلیوں سے جمانا، وہ مرمٹی تھی۔ وہ جو عام سی لڑکی تھی، لاہور کی شاید سب سے دلکش لڑکی دکھتی۔

خاور کی اعلا تعلیم، روشن ترین مستقبل اور خاندانی امارت سکینہ کو تفکر میں مبتلا کرتی۔ پھر پہلو میں سوئے شخص کو بغور دیکھتے رہنے کے بعد وہ مطمئن بھی ہو ہی جاتی۔

ابا شاد تھے..... پرسکون۔ شادی کے چوتھے ماہ بیمار پڑ گئے اور سکینہ کی قسمت نے بے سکون کر دینے والی کروٹ لے لی۔ ابا کو جگر کا کینسر تھا، آخری مرحلے میں۔

رات دن نے شکلیں بدل لیں۔ گھپ اندھیروں سی زندگی..... سرد قبروں سا انتظار۔ وہ گھر چھوڑ، کالج چھوڑ ابا کی پائنتی سے لگ گئی۔ ابا خون اگلنے لگے اور سکینہ کا مرتا ''پہلا عشق'' دنیا کی ہر روشنی پہ سیاہ رنگ پھیرنے لگا۔

''تو پاگل ہو جائے گی سکینہ! گھر کا چکر لگا لے۔ خاور بھائی کیا سوچتے ہوں گے۔''

خاور پہلے پہل خاموش رہا۔ پھر غصیل ہونے لگا اور ابا کی موت تک شانت ہو گیا۔

''کوئی نہیں، مجھے مشکل تو ہے مگر تم دیکھ لو۔ جیسا مناسب سمجھو۔'' وہ کہتا۔

''سکینہ! اللہ تجھ سے راضی ہو گیا ہے پتری۔'' وہ آلودگی صاف کرتی تو ابا رونے لگتے۔

''میں کیوں کہوں کہ رب مجھے بیٹا نواز دیتا۔ اللہ کا شکر واجب ہو گیا ہے۔'' وہ بڑبڑاتے۔

''رونا مت کہ شیدائی ہو جاؤ۔ بہنوں کو سنبھال لینا۔ اپنا گھر دیکھنا کہ خاصا نظر انداز ہو گیا ہے۔'' نصیحتیں کرنے لگتے اور پھر ابا چلے گئے۔ سکینہ کا دل اجڑ گیا اور نصیب بھی.....

☆☆☆

گلبرگ فیز ٹو کا وہ بنگلہ جیسے اپنے مدار سے سکینہ کو خارج کیے بیٹھا تھا۔ اسے ہفتہ بھر خود کو سمجھاتے لگا۔ نویں دن یکا یک اسے یہ وہم آن لگا کہ خاور کی مصروفیات اسے سکینہ سے غافل کیے دے رہی ہیں۔ وہ ہوشیار ہوئی۔ نرگسیت کو ابا کی تصویروں والے البم میں بند کیا۔ خود پہ توجہ کی۔ گھر پہ بھی۔ خاور متوجہ ہوا۔ نیا نیا موبائل فون آیا تھا۔ خاور کے پاس پہلے بھی تھا مگر اب تو صرف موبائل فون ہی تھا۔

''مصروفیات کچھ طویل ہو گئی ہیں حضور کی۔'' سکینہ کی ازلی دلکش مسکراہٹ۔

''تمہارا سوگ بھی تو جوان ہے۔'' تڑاخ سے جواب آیا۔

''فطری بات ہے۔'' اسے صاف نظر آنے لگی تھیں خالی جگہیں۔

''خالی جگہوں کا بھر جانا فطری بات ہے۔'' وہ دیر تک ایک ہی زاویے میں بیٹھی رہی۔

پھر غیر حاضری بھی شروع ہو گئی۔

''رات دوست کی طرف رکوں گا۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' وہ سرد سا دیکھتا بس۔

اسے عادت نہ تھی تنہائی کی، نظر انداز ہونے کی۔

ایک رات بارش بہت تھی۔ ابا کو گئے دو ماہ ہو گئے تھے۔ وہ بلا ناغہ روتی۔ خاور کے ڈر سے چھپ چھپ کے مگر اس رات بارش کی تڑتڑاہٹ اور بجلی کا نہ ہونا، دونوں نے اس کے حواس پہ خوف کو چڑھا دیا۔ وہ لینڈ لائن سے بار بار خاور کا نمبر ملاتی۔ ملائی..... نہ ملتا وہ پھر سے ملاتی..... روتی جاتی اور نمبر گھماتی جاتی۔

پھر فون اٹھایا گیا اور طوفانِ نوح مرکزی دروازے سے اندر گھس آیا۔ سب بہہ گیا۔ کیا تھا وہ سب جیسے.....

''ہیلو..... خاور.....'' وہ سسکی۔

''جان چھوڑ دو خاور کی۔ منحوس عورت۔ میرا ابھی کچھ لگتا ہے یہ۔ خبردار جو مزید ایک بھی گھٹی سنائی دی مجھے..... خبردار۔'' کوئی عورت تھی۔ مصری دور کے فرعونی جلاد سے لہجے والی۔ سکینہ کو کچھ سمجھائی ہی نہ دیا۔ وہ دن کے پیدا ہونے کی دعا کرنے لگی۔ پھر اپنے خواب سے اٹھ جانے کی۔

''آپا ہوں گی' کوئی پھوپھو..... کوئی بھی.....'' رات خدشے پیدا کیے جاتی۔ امید ہولے ہولے دور ہوتی جاتی، پھر صبح ہو گئی..... کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ سوئی ہو گی؟

صبح کی سہ پہر ہو گئی اور خاور شیر زمان گھر کو لوٹ آیا۔ تر و تازہ..... لاتعلق۔ وہ کسی ماں کی طرح اسے چائے پیتے دیکھتی رہی کپ خالی ہوا تو وہ کہنے لگی۔

"کل رات..... کل رات طوفان تھا بہت۔ تمہارا نمبر ملایا تھا میں نے..... ابا کو گئے دو ماہ ہوئے ہیں اور ان دو ماہ میں، میں نے تمہیں محسوس تک نہیں کیا۔ تو کل وہ عورت....."

یہ عورت بھی ناں..... کسی دوسری، تیسری عورت کا ذکر کیسا جاں کش لگتا ہے ناں عورت کو۔ اکیسویں صدی کے عجائبات دیکھو اور اس صدی کی عورت کے خوف دیکھو..... وہی بوسیدہ لرزے اور اوہام۔

خاور جیسے تیار تھا، ابرو اٹھا کے بولا۔

"سکینہ جانتی ہو تم سے شادی کیوں کی میں نے؟ تم سکینیت ہو۔ سکون ہو..... تمہاری ٹھنڈک تھی جس نے میری زندگی کا الاؤ لاجواب کر دیا تھا۔" وہ رکا۔ پھر نقطے پر آیا۔

"میں ڈراما نہیں چاہتا..... رونا دھونا..... واویلا۔ مجھے خلجان ہوتا ہے کوسنوں اور دہائیوں سے۔ فرزین بیوی ہے میری۔ پہلی بیوی..... ماڈل ہے۔ شادی کا اعلان اس کا کیریئر اور میرا سماجی رتبہ تباہ کر دیتا تو ہم نے ابھی تک خفیہ رکھا ہے۔ بیٹا ہے میرا۔ عمار شیر زمان۔ تم مجھے موزوں لگی تھیں اپنے تعلیمی پس منظر اور منطقی سوچ کو لے کر۔ فرزین کو کوئی اعتراض نہیں تھا اور بس..... تم سوچ لو۔ میری زندگی بس ایسی ہی ہے۔ تم جو بھی فیصلہ کرو مجھے منظور ہوگا۔"

یہ بیانیہ سنتے سکینہ کو یوں لگا کہ وہ گلی نمبر ایک پرانی انارکلی کے ایک مٹھائی والے کے گھر میں کھڑی ہے مگر کاؤنٹر کے پار اور خاور تیرہ خطوط اس کے منہ پر مارنے آیا ہے۔ وہ کیا کرتی؟ شور..... واویلا..... بین..... کوسنے..... بددعائیں..... وہ کیا کرتی؟

☆☆☆

بن ماں باپ کی سکینہ عبدالقیوم کچھ نہ کر سکی تو روئی۔ اتنا روئی کہ عرش کی گھاس بھی نم ہوگئی۔ اتنا روئی کہ بینائی کو ختم ہو جانے کے واہمے لگ گئے۔ اتنا روئی کہ پہلو پتھر ہو گئے۔ دیکھا تو رات دن میں ڈھلنے کو تھی۔ وہ گاڑی نکال کر اس گھر سے نکل آئی۔ گڑھی شاہو کا میاں میر صاحب قبرستان اسے ویران ہرگز نہ لگا۔ یقیناً بابے پوری کائنات سکینہ کی ویرانی کے آگے خس ہی۔ وہ بے بصارت ہوئی اپنے ماں، باپ کے ٹھکانوں کو ڈھونڈتی۔ اس رات..... اس نگل جانے والے اندھیرے میں سکینہ نے یہ بھی سیکھ لیا کہ زندگی میں ایک وقت آتا ہے جب شہر خموشاں ماں کی کوکھ سے بھی وفادار معلوم ہوتا ہے۔ جو چوس لیتا ہے اپنی خامشی میں..... ہر کرلاہٹ۔

"ابا! اب کیا کروں؟ میں تو اماں بن گئی ہوں۔ ایم۔فل سیاسیات۔ اسسٹنٹ پروفیسر۔ اماں..... اب کیا کروں؟" وہ روتی ہرگز نہ تھی۔ ابا، اماں کے درمیان بیٹھے جب وہ قبروں کی مٹی سہلاتی تو اماں یقیناً پہلو بدلتی ہوں گی۔

"اماں! میں کیا کروں گی؟" اماں سے سوال مختلف تھا۔

"تم کیسے نکالتی تھیں وہ سوئیاں خود میں سے، نیلا کر دیتی سوئیاں۔ ماضی خواب، حال بھیانک اور مستقبل لاغر کر دیتی سوئیاں۔"

غیر عورت کے نام پر دم کی، تعویذ شدہ سوئیاں..... مجھے خاور سے کبھی خوشبو نہ آ سکے گی۔ میری ہر آرائش کو زنگ لگ جائے گا۔ ہر ملکیت پہ غلامی کا ٹھپہ..... پھر میں کیا کروں گی اماں! کاش اماں! مجھے پہلے پتا ہوتا..... دوسری عورت کا غم ایسا ہے تو میں تمہارے مرنے پہ اپنا بچپن رہن نہ رکھتی۔ میں کھلکھلاہٹوں کو اپنے صحن میں لگے سکھ چین سے باندھ لیتی۔" اماں، ابا بھی اس کی سنتے سنتے اونگھ گئے ہوں گے، جب وہ لوٹی۔ جاتے ہوئے جو ناسور پلو سے باندھے گڑھی شاہو گئی تھی، ابا کے قدموں کی مٹی میں داب آئی۔ آتے ہوئے پلو میں باغی جذبے بھر لائی۔

انارکلی گلی نمبر ایک کا مٹھائی گھر اسے جشن مناتا محسوس ہوا۔ ایسا روشن اور پررونق۔ وہ جائے گی اور مرتضیٰ امجد سے تیرہ خطوط واپس مانگ لے گی اور بس..... وہ مٹھائی گھر سے کچھ فرلانگ پر کھڑی سوچتی۔ مرتضیٰ کی محبت تو بے شرط ہے، پھر کیسا

خوف.....وہ گاڑی سے اترنے لگی۔

''خطوط واپس کرنا آسان تھا، مستقبل تاریک نہ تھا تب۔ چھوڑ دیا ایک لڑکے کو کہ دنیا لڑکوں سے بھری تھی تب..... آسان تھا وہ سب.....تو کیا اتنی آسانی سے بن گئیں تم اچھی بیٹی۔ معاشرے کی نیک باعورت۔ شوہر راہ رو نکلا تو نکل پڑیں پرانے رستوں پہ سکون ڈھونڈنے۔'' ابا جیسے کھڑکی پہ ہاتھ مار کے کہہ گئے ہوں، وہ ساکت رہ گئی۔

''میں ہوتی تو بھلا کیا کہتی میری بچی۔'' اماں نے دوسری طرف والی کھڑکی بجائی۔

''جسے خدا کی پسندیدگی مطلوب ہو، وہ ترک کردہ گناہ طلب نہیں کرتے پھر۔''

''اماں! میں کب تک اپنی بند سانس سے جیوں گی۔'' وہ کرلائی پھر ڈائری نکالی۔ فائدے اور خسارے.....

''محبت تو اب نایاب ہوئی۔ طلاق کے بعد طعنوں سمیت برتا ہوا مرد ہی ملے گا۔ سائرہ کا گھر..... جو پہلے ہمارا گھر تھا.....اگر تنگ پڑ گیا تو؟ کسی کا خط آنا لوگوں کے لاتعداد سوال نامے لایا تھا تو طلاق نامہ کیسا ہوتا۔''

ایسے ہی بے شمار دلائل اور وہ چت ہوگئی۔ صبح صادق وہ سائرہ کے دروازے پر کھڑی تھی۔

''میں ابا، اماں سے ملنے آئی تھی۔'' سکینہ نظریں دوسرے پلنگ پہ گاڑ کے بولی۔

''خاور بھائی تمہیں پاگل سمجھیں گے، نکل آؤ ابا کے عشق سے باہر۔'' سائرہ تڑخی۔

''خاور تو خود پہلی بیوی کے عشق میں ہے۔'' وہ رونے جیسا ہنسی۔ سائرہ پہلی مرتبہ گنگ ہوئی۔

''آپا کو مت بتانا۔ بلاوجہ کا رونا دھونا مچائیں گی اور اب کے میرا دل پھٹ جائے گا اپنی بدبختی کے نالے سن کر۔''

آٹھ بجے سائرہ کے گھر سے نکلی تو تاکید کرتی آئی اور یوں سکینہ عبدالقیوم چھ ماہ میں ہی ''بیوہ'' اور ''طلاق یافتہ'' ہوگئی۔ لاہور پھر بھی چلتا رہا۔ ہنستا رہا اور بستا بھی۔

☆☆☆

وہ گھر لوٹی تو خاور شیر زمان نے اسے یوں دیکھا جیسے کوئی تاریخی فاتح، مفتوح ریاست کے باغ گزار شہنشاہ کو دیکھتا ہوگا۔ محبت سے پیٹ بھرا تھا اس کا..... خالی پیالہ چاٹنا، تازیانے سے مہلک لگا اسے۔

پھر وہ اعتماد سے سمجھوتے کی سیڑھیاں چڑھتی آگے بڑھ گئی۔ ایسے میں اسے لگا کسی نے تیز دھار آلے سے دل چیرا، کاٹا اور پھر کھول دیا۔ اک سہ مونہہ کانٹا عین وسط میں پیوست کیا اور ٹانکوں سے چھپا دیا۔

☆☆☆

خاور شیر زمان، سکینہ عبدالقیوم سے پہلے پہل لاتعلق ہوا۔

کمرہ الگ ہوگیا.....کھانے کی میز خاموش، سکینہ کا لباس پر شکن ہوا اور بال سلجھاؤ مانگتے۔ منگل و بدھ وہ گھر آتا۔ ملازموں کو شکل دکھاتا۔ کھاتا، سوتا اور واپس لوٹ جاتا۔ معلوم ہوا فرزین ماڈل نہ تھی کمرشل تھیٹر اداکارہ تھی۔ سکینہ مزید ہلکی ہوگئی۔ خاک سی.....دھول سی۔

لاتعلقی نے بے زاری کو جنم دے ڈالا۔

''وہ فون کرتی تو.....'' تمہیں بے وقت فون کرنے میں کیا لطف آتا ہے؟

سچ سنو رجاتی تو.....'' خدارا یہ نوٹنکی بند کرو۔ اس قماش کی عورت کے ساتھ ہوتا ہوں چار دن..... رنگ چبھتے ہیں مجھے۔''

''کھانا بنا لیتی تو.....'' میرے دل کا کوئی سوراخ معدے سے نہیں گزرتا۔ خود کو ہلکان مت کرو۔ پنجاب یونیورسٹی میں کوشش کرو سیٹ ہونے کی۔'' وہ خود غرض تھا۔ بدزبان اور بدلحاظ بھی۔

بے زار شخص نے اعتراضات کو انی بنا لیا اور سکینہ کا حلق تختہ عشق.....

''یہ جھاڑ جھنکار کبھی سلجھا ہی لیا کرو۔ نہیں تو جان چھڑاؤ ان سے۔'' خوب صورت بال کلے پیٹنے لگے اور سکینہ نے ان سے جان چھڑا لی۔ پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ سیاسیات کی اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئی۔

''خلیق جاوید سے دور رہنے کو کہا تھا کل جم خانہ

میں بڑا ہنس رہا تھا وہ تمہارا نام لے لے کر۔" سکینہ کی ساری ہنسی غائب ہوگئی۔

"تمہیں معاشرتی و سماجی آداب کی کچھ کلاسیں لینی ہی چاہیے۔ نہ سلیقہ نہ تمیز..... حسن و حسن کلام کے تو کیا ہی کہنے۔" سکینہ روتا تک بھولتی گئی..... مشین بنتی گئی۔ عمل کرتی غلام..... مناجات کرتی پجاری۔ اسے طلب کرتی دعائیں مانگتی۔ سوچتی۔

"خاور تو شرائط کا خدا بنتا جا رہا ہے۔ شرطیں تو ہیں محبت پھر بھی نہیں۔" سکینہ کو یہ بات خالی کرنے لگی۔

اعتراضات کا کبھی رد ہو جانا حتیٰ کہ تعمیل پانا بھی شکوک اگانے لگا.....

"یہ کس کے ایما پر آج کل مجھے نظر انداز کرنے لگیں....."

"نوجوان نظر آنے کے لیے محنت ..... واہ خوب،" تو کیا واقعی پچھلے چار دن گھر میں کوئی نہیں آیا۔

خاور کے اعتراض و بے زاری، شکوک اور بے عزتی اس میں حیران کن بے یقینی، دکھ، خود پرستی اور پھر بے حسی ابھارتے۔

وہ سسکتی.....

"کوئی یہ کانٹا نکال دے....." مرتضیٰ کو 'ناں' کہا تھا..... اللہ نے ناشکری جانا کیا؟" وہ الجھتی۔

جانے کب اللہ نے اس بنجر زمین پر انار کا بیج بویا تھا۔ اسے پتا تب چلا جب وہ نعمت واپس لے لی گئی۔ ہسپتال کے باسی گوشت سی بو والے کمرے میں ڈھائی سال بعد روئی تھی۔

☆☆☆

غلامان عشق مبتلا رہتے ہیں زندگی کی دھولوں میں بارہا
غلامان عشق وہ زندہ، ہیں کہ موت کو چاہ نہیں انہیں مارنے کی

سائرہ کہتی.....

"اسے چھوڑ دے سکینہ..... مرتضیٰ کی جگہ کسی اور کو دی ہے تو کیسے فٹ بیٹھے وہ....."

"یہی تو بات ہے سائرہ..... وہ مرتضیٰ نہیں کہ چھوڑنا لطیفے پر ہنس دینا جتنا آسان ہو..... ہنستے ہنستے چھوڑ دو۔ وہ خاور شیر زمان ہے جس سے محبت کی دعوے دار رہی ہوں میں۔ چار سو لوگوں میں بیاہ کے لے گیا ہے تو چھوڑے گا ساری دنیا کے سامنے۔ لوگ مجھ سے پوچھنے نہ آئیں گے کہ وہ راتیں کہاں بتاتا تھا..... وہ میری بدبختی کو بھی میرا اور مرتضیٰ کا 'چکر' سمجھیں گے۔ مجھ میں سکت نہیں میں خود کو گھسیٹ نہیں سکتی زبانوں کے کٹہرے میں۔ صبر بھی آ ہی جائے گا کہ اور کوئی چارہ جو نہیں بس یہ کانٹا....." وہ گلا مسلتی۔

"اللہ وہ لوٹ آئے۔" اس کی دعائیں۔

☆☆☆

غلامان عشق جگر سونپ کے چھید پالتے ہیں
مگر ہو جاتے ہیں ضمانت کچھ مسکراہٹوں کی

یوں تو رات کے انداز بدلتے رہتے مگر موسم تو ایک ہی ٹھہرا تھا سکینہ کے گھر میں دعا کا موسم، اللہ وہ لوٹ آئے، کی دعا گھر کے ہر گل دان، ہر چوکھٹ ہر کونے کو ازبر کروائی تھی سکینہ نے..... پھر.....

اور پھر وہ لوٹ آیا۔ شادی کے چار سال بعد..... ساڑھے پانچ سالہ بچے کی انگلی تھامے وہ غصیل دکھتا نہ ہی شرمندہ۔

"فرزین کو چھوڑ دیا ہے میں نے، عیسیٰ اس کی کامیابیوں کی راہ میں رکاوٹ تھا اس لیے میں اسے لے لایا..... تم بھی بہل جاؤ گی۔"

وہ کسی عیسیٰ پر وارفتہ ہوئی یا گھر لوٹے پیا پر..... فیصلہ کچھ مشکل نہ تھا۔ دعائیں رد نہیں ہوتیں۔ بڑبڑاتی، گھر میں قمقمے جل اٹھے۔ پھولوں نے باس دینی چاہی اور سکینہ نے آرائش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ گھر میں تین وقت چولہا جلنے لگا۔ چہل پہل نظر آنے لگی۔ جون کی تپش جانے کیسے مہربان رہی سکینہ کے آشیانے پر۔ یوں دو ماہ گزر گئے اور پھر۔

"جاوید بھائی..... خاور تین دن سے گھر نہیں آئے۔" وہ اضطراب سے انگلیاں چٹخاتی۔ فون کرتی خاور کے دوستوں کو۔

"وہ تو یونان میں ہے بھابھی..... بس اتنا معلوم ہے۔"

وہ کالج سے گھر واپس آتی ہے اور کوریئر سے

لفافہ موصول کرتی ہے۔ تصویریں دیکھتی اور جامنی ہوئی جاتی ہے۔

وہ لوٹ آئے..... وہ دعائیں مانگتی تھی۔ اور یہیں کا ہو کر رہے۔ یہ تو مانگا ہی نہیں۔ فرزین دنیا کی آخری عورت ہے اور خاور باوفا مرد..... یہ سوچ مات دے گئی تھی۔ وہ پاگل ہو رہی تھی۔ سکینہ عبدالقیوم کا مرد۔۔۔ اپنی اوٹ میں عورتیں چھپائے، اذیت دیتا۔ رقد، ملعون

"میں نے پوری دعا نہ مانگی۔" وہ بڑبڑائی۔

ملازم متاسف ہوئے۔

گیند کو زمین پر پٹخ کے اٹھانے کا حظ لیتا عیسیٰ اسٹور روم میں دھول ہوئی ہڈیاں بکتی "بڑھیا" کو دیکھتے ہی چیخا اور پھر وہ سکینہ عبدالقیوم ہی تھی کہ جس کی انگلیاں عیسیٰ شیر زمان کے گالوں اور ٹھوکریں پسلیوں سے اپنا ماضی واپس مانگتے۔

وہ رات سکینہ اور عیسیٰ کے لیے یکساں دردناک تھی۔ اسی رات نے سکینہ اور عیسیٰ کو ایک ہی دائرے میں آمنے سامنے کھڑا کیا تھا۔ وہ رات تنگی کے ساتھ آسانی کا معجزہ تھی۔ دعائیں واقعی رد نہیں ہوتیں۔ دعائیں بے موقع و بے مقصد ہو سکی ہیں۔

☆☆☆

اور پھر اس رات نے سکینہ کو باغی کر دیا ہر اس راہ سے جو خاور شیر زمان تک لے جاتی تھی۔ اس رات نے روشن کر دی ہر وہ دراڑ جس کو پھلانگتے وہ عیسیٰ شیر زمان کی ماں بن گئی۔ آخری بار وہ اس رات کی صبح کو روئی تھی۔ عیسیٰ کو سینے سے چمٹائے۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔" یہ الفاظ اس نے پہلی بار کہے تھے۔ اپنی سوتن کے بیٹے سے۔

"مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ سب سے ارفع..... خود سے ماورا محبت میرے بیٹے۔"

کیسی دھول اٹھی اس بوسیدہ جملے سے یادداشت کی الماریوں میں سب سے نچلے اور غیر استعمال شدہ خانے میں ان چھوا پڑا تھا یہ جملہ..... باپ کا مان..... دنیا کی زبان..... اسے اس جملے کی تاثیر معلوم ہی نہ تھی۔ پھر وہ کہنے لگی یہ جملہ بار بار۔

آنکھوں کی کوکھ اتنا حلتی کہ بانجھ ہونے کے درپے ہو جاتی۔ شوہر کو دیکھتی تو پسلیاں خود میں پیوست ہو ہو جاتیں باپ کا سوچتی تو تن جاتی۔

"محبت بیٹیوں کی دسترس میں ہو نہ ہو..... یہ فخر ضرور ہونا چاہیے کہ ان کے باپ کو دیکھ کر لوگوں کی زبانوں پر کبھی بیٹوں کے معاشقے نہیں آئے۔"

عیسیٰ شیر زمان نے سکینہ عبدالقیوم کی محبت تک دسترس یقینی بنا دی۔

"مما! مجھے آپ سے بہت محبت ہے۔" وہ اس کے جوتے کے تسمے باندھ رہی تھی جب وہ بولا۔

"مگر مما بہت ناخوش ہیں آپ سے..... ناراض ہیں۔" وہ اٹھلا کے بولی۔

"تو کیا میری محبت کو فرق نہیں پڑتا۔" انگریزی میں بولے اس جملے نے سکینہ عبدالقیوم کو قطب شمالی کا برفیلا ٹکڑا بنا دیا۔ بے شرط محبت..... تو دنیا میں مرتضیٰ اکیلا نہ تھا جو اس شے کا دعوے دار تھا۔ وہ سرسبز ہو گئی کہ اس نے اطاعت کی اور اللہ نے لوٹا دی ہر نعمت.....

اس دن عیسیٰ کی اولیول میں شاندار کامیابی پر دعوت کی گئی تھی۔ خاور نے مہمانوں سمیت دونوں ماں بیٹے کو حیران کر دیا۔

عیسیٰ کی بیرون ملک تعلیم..... کیمبرج میں داخلہ اگلے مہینے لندن روانگی۔ رات وہ پہلی بار خاور شیر زمان پر چیخی..... اور یہ آخری بار نہ تھا۔

"میں باپ ہوں اس کا تم فقط آیا۔ ماں مت بنو۔ اہل ہوتیں تو اللہ کو مجھ سے زیادہ علم ہے ہر شے کا۔" لفظوں و لہجوں کے زہر کو تریاق نہیں مانتا۔ تیل تیل بدن کے ساتھ بچوں سے ہمکتے عیسیٰ کو خود سے جدا کیا تھا اس نے اور تم نے دیکھا سونگھا ہے ہسپتالوں کے زیر زمین بنے سرد آرام گاہوں کو..... سکینہ عبدالقیوم کا گھر وہی بن گیا تھا۔

☆☆☆

"میں پاگل ہوں خود کی ڈسی عورت کے ہاتھ میں اپنے اکلوتے وارث کی لگامیں تھما کر بے گانہ ہو جاؤں۔"

یہ سن لینے کے بعد اسے عیسیٰ کے واپس کبھی نہ

آنے کا یقین ہو گیا۔ وقت نے اپنی ریتھ کو ایڑھ لگانے سے پہلے اس یقین پر سچائی کی مہر لگائی تھی۔

وہ کبڑی، برص زدہ بڑھیا بنتی گئی۔ بدصورت، بدزبان، چڑچڑی بڑھیا۔ وقت نے خاور شیر زمان کی شخصیت کو حرص بنا دیا۔ زیادہ سے زیادہ ہوتا حرص۔

"میں کہتی ہوں کوئی آسیب ہی رہے پر میرے گھر میں کوئی رہے۔" دوست کا جادو زدہ بنگلہ دیکھتے وہ بولی تو سب کو دکھ نے منجمند کر دیا۔

وہ سائرہ کے گھر جاتی بیٹھ کر اس کے بچوں کو دیکھتی رہتی۔ اس کا بیٹا شناختی کارڈ بنوانے گیا۔

"ہماری اسیری کو انیس بیس سال ہو گئے۔" بھولا حساب تازہ ہو۔

آپا ساس کے بعد گھر پر حکمرانی کرتیں۔ خوب صورت ذہین فطین اولاد اسجد بھائی کو ٹھنڈک دیتی۔

"اگر اولاد ہی ہو جاتی..... جو تھی وہ ہی رہ جاتی۔" پھر سے بڑبڑاہٹیں۔

"سکینہ! یوں بڑبڑایا مت کرو۔ مجھے خوف آنے لگتا ہے۔" سائرہ رو دیتی۔

وہ چار دن بہتر ہوتی پھر وہی۔

"کسی دماغ کے ڈاکٹر کو دکھاؤ بڑھیا۔" خاور ہاتھ جھٹکتا۔

وہ دکھانے لگی۔ نیند کی گولیاں کچھ ورزشیں اعصاب کو سن کر دیتی دعائیں، جانے وہ کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ یہ بات ڈھونڈنے میں تین گھنٹے لگ جاتے۔

کبھی ثریا آپا کی مریم رہنے آ جاتی۔ کھانے بنا لیتی۔ صفائیاں..... سکینہ کے سر کا مساج، وہ بہل جاتی۔

"خالہ کب آئے گا تمہارے شوہر کا بیٹا جو بلا ناغہ آپ سے کہتا تھا کہ اسے محبت ہے آپ سے۔ اب تو ہمارے ماسٹرز کو بھی سال ہو گیا۔" عیسیٰ کی ہم جماعت تھی۔

کبھی تصویریں کھول کے بیٹھ جاتی۔ نقلیں اتارتی۔

"مما یہ ڈزنی ورلڈ کی جادوگرنی ہے۔ اوگاڈ تمہیں پلے اسٹیشن چلانا نہیں آتا۔ تمہارے گھر جنریٹر بھی نہیں ہے۔ سیل فون ایسا ہوتا ہے۔ دیکھ لیا کبھی لے بھی لینا۔" سکینہ خوب مسکراتی۔ وہ نقل اتارتی تو سکینہ کو لگتا عیسیٰ ہے۔

"نہیں ہیں میرے پاس اتنے پیسے کہ لاکھوں کی ٹکٹیں خرید کر دوں اس شہزادے کو تمہارے درشن کے لیے۔" خاور جھڑکتا وہ چیختی۔

"روپے میرے پاس تم سے زیادہ ہیں۔ میں اسے بلوا سکتی ہوں مگر وہ تمہاری ناراضی کے ڈر سے نہیں آتا۔"

"میں خود چلی جاؤں گی۔" دھمکی۔

"دیکھ لو جا کے کبھی نہیں ملے گا تم سے وہ میرا بیٹا ہے۔" ہمت ٹوٹ جاتی۔ پھر.....

"مما! میں کچھ مصروف ہوں۔ کچھ گیسٹ آئے ہیں۔" وہ ابھی سو کر اٹھا تھا شاید۔ سکینہ کو چمکتی اسکرین پر عیسیٰ کے کندھے کے پیچھے کسی کا برہنہ کندھا..... سکینہ کو مریم کا نیلا پڑتا رنگ سب سمجھا گیا۔ وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

"خون کا اثر..... بے وفائی تمہارے وجود میں پھونکی گئی ہے تربیت کیسے جیت پاتی۔ مر گئی تمہاری آپا، تمہارے لیے۔" اس نے اسکائپ سے عیسیٰ کو بلاک کر دیا۔ ہر رابطے کا ذریعہ بند کر دیا۔ مریم اسے سنبھالتی رہی۔

"وہ واقعی خاور کا بیٹا ہے۔" بڑبڑاتی رہی۔ مریم اس رات رک گئی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ سکینہ کو اپنے سینے پر سات زمینوں کا بوجھ محسوس ہوا۔ وہ سانسوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کرنے لگی۔ پھر اٹھ آئی۔ مریم کو دیکھنے۔ وہ گیسٹ روم کا دروازہ کھول ہی رہی تھی کہ مریم ٹھک سے اس کے ساتھ آ لگی۔ سکینہ کے دوائی زدہ سن اعصاب کچھ کچھ جاگ اٹھے اور پھر پورے جاگ گئے خاور کو مریم کے کمرے سے نکلتے دیکھ کر۔ کتنی قیامتیں جھیل چکی تھی سکینہ مگر ایسی قیامت..... اس مردہ خانے سے گھر کو جیسے کسی نے دوزخ کے سب سے گہرے گڑھے میں جھونک دیا ہو۔

وہ دیواروں سے سر ٹکراتی..... واقعی ٹکراتی۔ بین

کرتی۔ پھٹی آواز میں چیختی۔ ملازم اٹھ آئے۔ وہ جو پچھلے بیس سالوں سے پاگل ہو رہی تھی۔ اس دن حقیقتاً پاگل ہی ہوگئی۔ اس سوختہ تقدیر سے منہ چھپائے مریم صرف رو رہی تھی۔ ملازم آنکھوں کے آنسو چھپاتے، خاور فرار چاہتا تھا وہ گریبان سے پکڑتی۔ وہ تباہ کر دینا چاہتی ہر شے کو۔ ۔گل دان..... پینٹنگز وہ سامان پھینک رہی تھی اور یکا یک خاور ایک گل دان کے سامنے آرکتا ہے۔ زخمی ہو جاتا ہے۔

''تم نے کہا میں بدکردار.....تو ہاں.....ایک پاگل سے کتنا نبھاؤں میں۔''

''ہاں ہاں پاگل ہوں میں۔'' وہ اونچی آواز میں چیخنے لگی۔

''اب تو تم اپنے اصل مقام کو ضرور پہنچو گی۔''

وہ خود پر چیزیں توڑنے لگا۔ مریم گھبرا گئی۔

''خالہ چلیں یہاں سے۔'' سکینہ کو کھینچنے لگی۔ مگر دیر ہو گئی تھی۔

خاور شیر زمان اتنا مکروہ ہوگا سکینہ بیس سال میں نہ جان سکی۔

اگلے پانچ گھنٹوں میں وہ حوالات میں تھی۔ شوہر پہ قاتلانا حملہ کرنے کے جرم میں اور پھر اگلے چودہ دن میں ذہنی صحت کے ادارے میں۔

☆☆☆

''خالہ میں ہائی کورٹ میں اپیل دائر کرنے جا رہی ہوں۔'' مریم اس سے کہہ گئی تھی۔ سیشن کورٹ میں فیصلہ سکینہ کے خلاف ہوا تھا۔ نوکری چلی گئی۔ بات میڈیا تک بھی چلی گئی۔ وہ ذہنی بحالی کے ادارے کی مستقل مریضہ بن گئی۔

''خود کو مت تھکاؤ مریم میری جان۔''

''آپ کے اسی رویے نے مجرم ثابت کر دیا تھا۔'' وہ ماں بن جاتی۔ سمجھانے لگی۔

''لوگوں کی زبانیں بند ہونی چاہئیں خالہ! وہ شخص تو سرخرو ہو گیا ہے۔ آپ نے کیا ہے اسے معتبر۔''

''لوگوں کی زبانیں بند کرنے کے لیے ایک ناموزوں قدم اٹھایا تھا جوانی میں آج تک وہ قدم مجھے آگے بڑھنے نہیں دے رہا۔ پٹخیاں دے رہا ہے۔ اب کرنے دو لوگوں کو مباحثے۔''

سائرہ نے سنا تو بالآخر سالوں بعد بول اٹھی۔

''نکل آؤ اس ملال سے باہر سکینہ! کہ مرتضیٰ کو چھوڑنا ہی اس عذاب کی وجہ ہے۔ یہ ملال تمہاری آواز کھا گیا۔ وہ آواز جو خاور کے خلاف پہلے دن اٹھی ہوتی تو تم آج اس بدنامی اگلتی دلدل میں دھنسی ہی نہ ہوتیں۔

میں پاگل تھی جو تمہیں دھکیلتی تھی مرتضیٰ کی گلیوں کی طرف، سچ تو یہ ہے کہ تب اگر تم نے ابا کا اور اپنی عزت کا لحاظ طاق میں جھونک کر مرتضیٰ کو پالیا ہوتا تو آج تم بہت ہلکی ہوتیں میری نظر میں۔ ثریا آپا کبھی مریم کو تمہارے گھر نہ بھیجا کرتیں۔ چاہے مرتضیٰ کی پارسائی یوم حساب سی مسلم ہی کیوں نہ ہوتی۔ اسجد بھائی، مریم کو کبھی اپنی کمائی تمہارے لیے وکیلوں پر لٹانے نہ دیتے۔ اور جنید۔ جو فون کر کر کے تمہیں اپنے گھر بلاتا ہے۔ بچوں کے لیے کون سا اسکول کالج کون سی ڈگری کون سا مضمون بہتر ہوگا تک تم سے پوچھ کر کرتا ہے۔

وہ جنید کبھی مجھے تم سے فون پر بھی پانچ منٹ سے زیادہ بات نہ کرنے دیتا۔ آج ہم دونوں بہنیں جو تمہارے لیے کسی بھی حد تک جا رہی ہیں۔ مرتضیٰ سے شادی کے بعد اس وقت اپنے شوہروں کو تمہارے کردار کی گواہیاں دے رہی ہوتیں۔

مانا کہ بہت برا ہوا ہے سب مگر کچھ بہت اچھا بھی ہوا ہے ناں۔ پسند کی شادی کوئی بری بات نہ تھی مگر معاملات جس رخ پر مڑ گئے تھے تمہارے شادی ایک طرح کا کورٹ میرج ہوتی۔ نازیہ رزاق کہتی ہے ناں۔

''بیٹوں کی دسترس میں محبت ہو نہ ہو..... یہ فخر ضرور ہونا چاہیے کہ ان کے باپ کے کندھے ان کی شرمندگی، بدکرداری کی وجہ سے نہیں جھکے۔''

ابا آخری سانس تک کہتے رہے۔ سکینہ اللہ تجھ سے راضی ہو گیا۔ ہمیں کہتے رہے سکینہ کو دیکھنا میرے بعد۔

تمہارے پاس یہ فخر ہے کہ لوگ دیکھ کے کہتے ہیں بیٹوں کو پڑھاؤ کہ وہ اتنی مضبوط ہو سکیں! خدارا لڑو خود کے لیے ورنہ زندگی سراب نکلے گی۔ کس راہ پہ نکلی

تھیں اور کس منزل کو جا نکلیں، جیسے ملال تمہیں مرض الموت کے جیسے چمٹ جائیں گے۔ ہمارے لیے بولو۔ اپنے بیٹے کے لیے بولو۔

سکینہ عبدالقیوم کی بے اثر دوائیاں حیران رہ گئیں اور سائرہ عبدالقیوم کی تھپکی کام کر گئی۔

☆☆☆

موسموں کی ڈھیٹ رنگ دار چرخی گھومی اور بہار کی گود میں حکم آ گرا۔ مریم خاصی پرامید تھی۔ آخری تاریخ سننے کو اور اپنے حق میں بولنے کو وہ عدالت آئی۔ پہلے بھی آئی تھی مگر اس بار کا آنا اسے گونگا کر گیا۔ مریم اسے بتاتی کہ شیر زمان خاندان جج بدلنے کی درخواست کر رہا ہے۔ وہ بے خبر رہتی کہ وقت کے سینے میں گرا وہ کانٹا نکلنے کو ہے۔

مرتضیٰ امجد شریف..... سینئر ہائی کورٹ جج، ایک شان دبدبے اور اصول کا نام، وہی مرتضیٰ شریف کہ جس کو کبھی سر پھری خوددار گلی نمبر 1 کی لڑکی سے لامشروط اور لامحدود محبت ہو گئی تھی۔ کچھ نہیں بہت کچھ مختلف تھا۔

فاضل جج کی کرسی پر بیٹھا وہ مغل شہنشاہوں کا جانشین دکھتا تو وہ پناہ لینے آئی ملک بدر روبد بخت۔ وہ وکیل کے دماغ کے ذلت میں لتھڑے الزامات گھٹتی سانسوں سے سنتی جبکہ اونچی مسند والا پرشوق دکھتا۔

دوپہر کے کھانے کا وقفہ ہوا تو اسے جج صاحب کے سامنے لے جایا گیا جو منہمک سا ٹھنڈی گوشت کھاتا اور سکینہ عبدالقیوم کو کھڑا رکھتا۔ بیٹھنے کو نہ کہنا۔

"ابا کی اچھی بیٹی..... بہنوں کی اچھی بہن..... پڑھی لکھی باعزم..... دلوں کو جوتی کے تلوؤں سے دابتی سکینہ عبدالقیوم کس حال میں ہے آج؟"

"نئے لوگ آنے سے نئی فہرستیں بن جاتی ہیں..... منافع..... خسارے..... تمہارا تو ہر حساب تمہارے منہ پر پڑ گیا گلی نمبر 1 کی لڑکی۔"

سکینہ کو پہلی بار وہ بے حال لگا۔ شان سے بیٹھا مفلس شخص۔ وہ بیس سال بعد مسکرائی تھی۔

"ابا کو مرے بیس سال ہو گئے۔ شکر ہے یہ سب ان کے نصیب میں نہ ہوا۔ زندہ بھی ہوتے تو طلاق کے دھبے کو ڈھانپ لیتے۔ "بیٹیوں کے باپ، بیٹیوں کے نصیب کی سیاہی سے لڑ لیتے ہیں مگر کردار کی سیاہی ان کی عاقبت تک نیلی کر دیتی ہے۔ اب تو سمجھ ہی گئے ہو گے۔ بیٹی کے باپ جو بن گئے ہو۔"

مرتضیٰ امجد کو لگا کہ وہ کانٹا..... سہ مونہہ جو کسی رخ چین نہ لینے دیتا تھا۔ آج پانی بن کر رگوں میں گھل گیا ہے کہ وہ واقعی بیٹی کا باپ تھا۔ جوان بیٹی کا باپ۔

وقفے کے بعد کارروائی شروع ہوئی تو جیسے یکا یک فیصلہ سکینہ کے حق میں ہو گیا۔ کیونکہ گواہوں کے کٹہرے میں اس کا بیٹا کھڑا تھا۔ سوجی آنکھوں، متورم پلکوں اور غیر متزلزل آواز و لہجے والا عیسیٰ شیر زمان، وہ خاور کی آنکھوں میں دیکھ کے کہنے لگا۔

"اگر یہ عورت بدکردار ہے تو یقین مانیں دنیا میں وفاداری ناپید ہے۔ اگر یہ مرد بے گناہ ہے تو مجھے کسی نیکی پر بھروسا نہ رہا۔"

دو ملازم بھی ہمت دکھا کے ڈٹ کے بولے اور وہ آزاد ہو گئی۔ ہر الزام، ہر ملال۔ ہر حسرت سے۔

☆☆☆

"مما! قسم سے وہ سیم کی دوست تھی اور میں اس رات بارش کی وجہ سے وہاں رک گیا تھا۔"

جھنجلاتی آوازیں۔ ایک خوب صورت اپارٹمنٹ کا پررونق منظر کہ جس میں میکرونی ابالی جاتی۔ سبزیاں "حلال" کی جاتیں۔

"چلیں ٹھیک ہے پھر..... اس دفعہ مت جانے دیں مجھے۔ باندھ لیں کسی اندرون لاہور کی کھونٹی سے۔ سبزیاں کاٹتی چھری رکی پھر بیٹے کے سینے پر تن گئی۔ بالکونی کے پردوں نے ہل ہل کے یہ قہقہے لگاتا مرد اور بے ساختہ ہنستی عورت آسمان کو دکھائی۔

"تم دونوں بہت گھنے ہو۔ میں ہی سب سے نزدیک اور زیادہ بے خبر بھی۔" سکینہ مسکراتی کہتی۔ گھڑی کی سوئیاں ہندسوں سے سر ٹکراتی بڑھتی رہتیں۔ غلامان عشق نکالتے ہیں وقت کے بدن سے جادوئی سوئیاں پھر آن لیتی ہے ان کو فنا پذیری..... غلامان عشق مر جاتے ہیں

☆☆